انگارے اور ہتھیلیاں

جابر حسین

کیا تم نے تاریخ کا وہ باب نہیں پڑھا، جہاں ہماری قربانیوں، ہماری تکلیفوں کی ہمیشہ زندہ رہنے والی مثالیں درج ہیں؟ کیا تم نے ان مثالوں سے نہیں سیکھا کہ ہم اور ہمارے پرکھے آگ کی راہداریوں سے کس طرح ہنستے مسکراتے گزرتے رہے ہیں؟ کس طرح آگ کی بٹیاں اور انگاروں کی سیج ہمارا مقدر بنی رہی ہیں، کیا تم نے نہیں جانا! کیا تم انجان ہو اس حقیقت سے کہ تمہارے پرکھوں کی پشت پر زہریلے نیزوں کی گنی سے حملے ہوئے، اور ان کے سر ان کے دھڑوں سے الگ کر دیئے گئے؟

کیا تم نے نہیں جانا کہ تمہارے مورث صرف اس لئے گمنام جگہوں پر دفن کئے گئے کہ ان کے دشمن قبر سے ان کی لاشیں نکال کر ان کی بے حرمتی نہیں کریں!

کیا تم نے ان میں سے ایک بات بھی نہیں جانی! کیا تم تمام زندگی سچ مچ ان باتوں سے غافل رہے!

اگر یہ سچ ہے کہ تم تاریخ کی ان اہم سچائیوں سے سچ مچ انجان رہے، تو ہمارے دل میں تمہارے لئے ہمدردی کا جذبہ ہے۔ لیکن جان لو کہ قدرت نے تمہیں بھی، ہماری ہی طرح، یہ ذمہ داری سونپ دی ہے کہ تم بھی، ہماری طرح، اپنی آنے والی نسلوں کو بتا سکو کہ ہم اور ہمارے مورث کس طرح اپنی ہتھیلیوں پر انگارے لئے آگ کی راہداریوں سے گزرتے رہے ہیں۔

لیکن اپنی نسلوں کو یہ سب بتانے کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ تم خود بھی آگ کی راہداری پر چلنے کی مشق کرو، اور اپنی ہتھیلیوں پر انگاروں کے رستے سنبھالے آگے بڑھو۔

انگارے اور ہتھیلیاں

تخلیقیت کے آتش کدے میں جب آگ دہکتی ہے تو اکثر اصناف اور ہیئتوں کی حدیں پگھل جاتی ہیں۔ اصناف کی پہچان اور ہیئتوں کے پیمانے اپنی جگہ، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تخلیقیت کے ہاتھوں ان میں فقط توسیع ہی نہیں ترمیم وتنسیخ بھی ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح معنی کا حکم فقط مصنف نہیں، متن (تخلیق) اور قاری کا تفاعل بھی اس میں شامل رہتا ہے، اسی طرح صنف کا حکم بھی فقط مصنف نہیں، تخلیقی حسیت کیا کیا نقش بناتی ہے اور قاری اسے کیسے پڑھتا ہے، بہت کچھ اس پر بھی منحصر ہے۔

پچھلے دس پندرہ برسوں سے میں جابر حسین کی تحریروں کو پڑھتا رہا ہوں کہ کس طرح خاموشی سے ان تحریروں نے اردو فکشن کی دنیا میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ یہ دنیا ہی الگ ہے۔ وہ اپنی کتاب (سن اے کاتب: ۱۹۹۷ء) کا انتساب 'سماجی آئینہ داری کی اس صنف کے نام جو ان تحریروں میں اجاگر ہوئی ہے' کے نام کرتے ہیں۔ بات گاؤں دیہات قصبات کی نہیں، جابر حسین جس مخلوق کا ذکر کرتے ہیں بظاہر وہ انسان ہے، لیکن جو گزر بسر وہ کرتی ہے اور جس سماجی فضا میں وہ سانس لیتی ہے اور جو برتاؤ اس کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ بعض دوسری زبانوں میں تو پچھڑے لوگوں اور جانوروں کی زندگی جینے والوں پر آنچلک کے نام سے بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اردو میں یہ پنا ابھی خالی تھا، جس طرف جابر حسین نے توجہ کی ہے۔ اس لحاظ سے جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ ایک الگ تجربہ ہے۔

۲۰۰۲ء میں، جب ان کا دوسرا مجموعہ 'ریت پر خیمہ' شائع ہوا تو اس پر صاف اعلان تھا: 'جابر حسین کی ڈائری'، حالانکہ ان کی تخلیقیت بہت پہلے ان کی وقائع نویسی کو زیادہ تر کہانیوں کا روپ دے چکی تھی۔ اب تو نئی آگہی بھی اثبات کرتی ہے کہ جب ہم کسی بھی چیز کو بیان کرتے ہیں تو زبان اسے شفاف نہیں رہنے دیتی۔ اور تو اور، تاریخ کا متن بھی متنِ محض نہیں، ورنہ سب تاریخیں ایک جیسی ہوتیں۔

جابر حسین نے اپنی تحریروں سے جو دنیا قائم کی ہے، دراصل وہ قائم ہی اس لئے ہو پاتی ہے اور اس میں دردمندی و تاثیر بھی اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ اولاً ان میں تخلیقی زبان خود کو قائم کرتی ہے۔

گوپی چند نارنگ

فکشن شعریات تشکیل وتنقید/۲۰۱۳

انگارے اور ہتھیلیاں

کتھا ڈائری

جابر حسین

اردو مرکـــز عظیم آباد

انگارے اور ہتھیلیاں

جابر حسین

آرٹ : بہ شکریہ گوگل
تکنیک : شمشیر قمر

مارچ ۲۰۱۴ء

قیمت : ۳۰۰/روپے

دستیاب

• اردو مرکز، عظیم آباد
247، ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ۔800020
فون اور فیکس : 0612-2354077

• بک امپوریم
اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔800004

• آستانہ بہار
باولی، شیخ پورہ۔811105

Angare Aur Hathelian
Jabir Husain ki Katha Diary

Urdu Markaz
247 MIG, Lohia Nagar
Patna-800020, Bihar

Rs. 300/-

طباعت : وکاس کمپیوٹر اینڈ پرنٹرس، نوین شاہدرہ، دہلی۔32

اِرم اور مونش کے لئے

انگارے

لیکن میں / 11
کالے پتھروں کی گپھا / 18
آخری خط / 27
لمحے / 37
انکل مائک / 44
دوسری دنیا / 51
وہ ایک رات / 57
گڈی / 63
بند آنکھوں سے / 71
فلاور نوک / 80
گنگا تیرے اکتارا / 87
دھوئیں کی بو / 93
آخری راؤنڈ کا کھیل / 100
مرگنگا میں ڈوب / 106

ہتھیلیاں

کالے جسموں کی آگ / 115

ڈمپنگ گراؤنڈ / 118

کھیل شاید ختم ہو چکا ہے / 123

انگارے اور ہتھیلیاں / 128

پہلی عبارت / 131

سوہا کے نام / 133

سارا کے لئے / 139

گنبد بے خالی / 144

سنہرے اکشر / 149

ندی کی پوشاک / 153

اکیلی نہیں ہوگی دھوپ / 157

زندہ ہونے کا ثبوت / 161

ایک بار، شاید تمہیں یاد ہو، آسمان پر چھائے بادلوں کے ایک آوارہ ٹکڑے نے کھیتوں کی گود میں گرتے سورج کو پوری طرح اپنی مٹھیوں میں بند کر لیا تھا۔ ہم دونوں کچھ لمحوں کے لئے کانپ گئے تھے۔ ہمارے شہر کا سورج ڈوبنے کے پہلے ہی کالے دھبوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔

اس دن تم نے اپنی ہتھیلیوں سے میری آنکھوں پر سایہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہم اور تم، دونوں خاموش، آسمان کے اس حصے کی طرف دیکھتے رہے تھے، جہاں آوارہ بادلوں نے سورج کو اپنے اندھیرے سے ڈھک لیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم، اس دن اور کیا ہوا تھا، لیکن میری اور تمہاری آنکھوں نے کچھ لمحوں کے بعد ہی دیکھا کہ سورج آوارہ بادلوں کی مٹھی سے نکل کر دوبارہ آسمان اور زمین جہاں ملتے ہیں وہاں دور دور تک پھیل گیا اور اس کی لال سرخ کرنوں نے پورے افق کو اپنے وسیع دائرے میں سمیٹ لیا۔

لیکن میں

ٹلا رام اپنے گھر کی تنگ سیڑھیوں کی آخری ٹیک پر تھا کہ اس کے دماغ میں باپ کی کہی بات دوبارہ کوندھی —

'کل سے، انہی میں سے کسی ایک گودام میں جا کر بیٹھا کر، گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہیں بیڑی بنا کر اپنا پیٹ پالنے کی سوچ۔ آج سے تیرے لئے اس گھر کے دروازے بند۔'

ٹلا رام کو باپ کی کہی بات اور اس کے دھکے یاد آتے ہی یہ خیال بھی آیا کہ اس نے سیڑھیاں اترنے سے پہلے اپنی ماں سے ملاقات نہیں کی، بلکہ اس دالان کی طرف دیکھا تک نہیں، جہاں اس کی ماں ہر وقت کسی کام میں الجھی رہتی ہے۔

ایک لمحے کے لئے تلا رام نے سوچا، سیڑھیاں دوبارہ چڑھ کر ماں سے آخری بار ضرور مل لینا چاہئے۔ آخر اس میں اس کی ماں کا کیا قصور ہے؟ قصور تو سارا تلا رام کا ہی ہے۔ وہی تو اپنی مرضی سے اسکول کا بستہ پٹخ کر ہر روز کوئی کتاب یا میگزین لئے گودام پہنچ جاتا ہے۔ گھر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کھیلنے کودنے نکلا ہے، اور گھنٹے بھر بعد لوٹ آئے گا۔

ایک دن، دیر شام، گھر لوٹنے پر روٹیاں پروستے وقت ماں کو تلا رام کے کپڑوں سے تمباکو کی بو آتی محسوس ہوئی تو اس نے تلا رام کو ٹوکا —

'تمباکو کی بو آرہی ہے، تیرے کپڑوں سے۔ کہاں گیا تھا، بول کن کے ساتھ اودھم مچا کر آیا ہے۔'

جھوٹ بولنے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا، تلارام کے پاس۔ وہ جانتا تھا، سچ بولنے کا مطلب ہوگا باپ کے ہاتھوں پٹائی، جس کے بارے میں سوچ کر ہی وہ ایکدم سے ڈرنے لگا تھا۔

'کھیلتے وقت کوڑے کے ڈھیر پر گر گیا تھا، وہیں تمباکو کا کوڑا پڑا تھا۔'

تلارام نے صفائی کے ساتھ جواب دیا اور روٹیاں جلدی جلدی منہ میں ڈالنے لگا۔ دالان کے ایک طرف، اس کے سوال جواب سے بے خبر، باپ کی نظریں اخبار کے صفحے پر جمی رہیں۔

اگلے دن، ایک اور کتاب تلارام کے ہاتھ لگ گئی، جس کے کچھ حصے تو اس نے اسکول میں ٹفن کی گھنٹی کے بیچ ہی پڑھ ڈالے۔ کارخانہ مزدوروں کی لڑائی سے بھری تھی وہ کتاب، جس میں ان پر ہونے والے ظلم اور کارخانہ مالکوں کے خلاف چلنے والی لڑائیوں کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ پولس کی زیادتیوں کا بیورا تھا۔

گودام میں اس روز عام دنوں سے زیادہ بھیڑ تھی۔

سراج میاں کے گودام کے مزدور بھی اپنا کام ختم کر کے کہانی سننے وہیں آ گئے تھے۔

گودام میں پیٹرومیکس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور گہرا سناٹا تھا۔ بیچ بیچ میں، کسی کے کھانسنے کی آواز اور تیز تیز چلنے والی سانسیں ضرور سنائی دے جاتی تھیں، جس سے گودام کا سناٹا کچھ لمحوں کے لئے تھم جاتا تھا۔

کتاب دلچسپ تھی۔ کتاب کے ہیرو کی تقریروں میں سہرن پیدا کرنے والا اثر تھا۔

تلارام کے کہانی پڑھنے کے ڈرامائی انداز سے کہانی میں اور جان آ گئی تھی۔

ایک باب، دو باب، تین باب!

تلارام کتاب پڑھتا گیا، کتاب کے صفحے الٹتے گئے۔ گودام کے مزدوروں کی انگلیاں تیزی سے چلتی رہیں۔ پتے کاٹتی، تمبا کو بھرتی، دھاگے لپیٹتی انگلیوں کے نکیلے ناخن کا بڑھتا پیلا پن دیکھنے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔

گودام میں جلنے والے پیٹرومیکس کا تیل ختم ہونے کو نہیں آجاتا تو شاید تلارام کی کہانی دیر رات تک اسی طرح جاری رہتی۔

تلارام، اوردنوں کے مقابلے، کچھ زیادہ ہی وقت گزار کر اس دن گھر لوٹا۔ اس لئے سب کی نظر میں اس کا آجانا فطری تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی، سب سے پہلے ٹوکنے والی اس کی ماں تھی —

'کہاں تھا، اتنی دیر؟ کس کے ساتھ تھا؟'

تلارام کو معلوم تھا کہ اس کی ماں اس بات سے زیادہ فکر مند رہتی ہے کہ وہ گھر سے باہر کس کے ساتھ اپنا وقت گزارتا ہے۔ یہی وجہ ہے، وہ ہر دم ماں کے لئے بھروسے لائق جواب تیار رکھتا تھا۔

'موسی کے گھر گیا تھا، وہیں دیر ہوگئی۔ موسی نے کھانے کے لئے روک لیا تھا۔'

موسی سے ماں کے رشتے بہت گہرے تھے۔ وہ دراصل ماں کی سب سے کمزور نبض تھی۔ اس کا نام آتے ہی ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو جایا کرتا۔ بلکہ اس کا نام سنتے ماں کی آنکھوں میں بوندیں چھلک آتیں۔

'موسا گھر میں تھے؟ کوئی ہنگامہ تو نہیں ہو رہا تھا؟ شراب پی کر تو نہیں آئے تھے موسا؟ موسی خوش تو لگ رہی تھی نا؟'

تلارام ماں کے ان سوالوں کے لئے تیار نہیں تھا۔

'موسی نے کل پھر بلایا ہے، کل سب کچھ دیکھ کر آؤں گا۔'

تلارام ماں کو ٹال گیا۔

ہاتھ منہ دھوکر کھانے کو بیٹھا تو تلارام کو باپ کی کھوجی آنکھیں اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئیں۔ پہلا نوالہ ہی جیسے مشکل سے گلے اترا۔

'امتحان میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ کل سے اسکول کے بعد سیدھے گھر آنا ہے، کھیل کود بند۔'

تلارام کو باپ کے الفاظ انگاروں کی طرح کان کے پردوں پر ٹپکتے محسوس ہوئے۔ کھیل کود بند، اور اسکول سے سیدھے گھر آنا ہوا، تو گودام میں کتاب کا باقی حصہ پڑھ کر کون سنائے گا!

تلارام گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اگلے دن، اسکول کی دو گھنٹیاں تلارام نے کسی طرح پوری کرلیں۔ تیسری گھنٹی میں، اس کا دل اسے بے چین کرنے لگا۔ تلارام کلاس سے نکل کر ٹیچر کے پاس گیا، پیٹ میں درد کی شکایت کی، اور بستہ سنبھالے اسکول سے باہر آ گیا۔

گودام والی گلی کی طرف مڑتے وقت اپنے جانتے اچھی طرح دیکھ کر تلارام نے اطمینان کرلیا کہ آس پاس کوئی اس کے اس طرح اسکول سے بھاگ کر آنے کی شکایت اس کے باپ سے کرنے والا تو موجود نہیں ہے۔

سیلن بھرے گودام میں، کام پر جٹے مزدوروں نے وقت سے پہلے تلارام کو وہاں دیکھ کر حیرت اور خوشی جتائی۔

'اسکول میں چھٹی ہوگئی۔ وہ تھا نا، رامو، کافی دن سے بیمار تھا۔ آج صبح مرگیا۔ اس لئے چھٹی ہوگئی۔'

تلارام کو بہانہ تراشنے میں مہارت حاصل تھی۔

دن کا سارا وقت تلارام نے اس روز گودام میں ہی گزارا۔ سارے باب کتاب کے اس نے مزدوروں کو پڑھ سنائے۔ آخری باب، جس میں ہیرو کی موت کے ساتھ مزدوروں کی جیت کا ذکر تھا، مزدوروں نے دوبارہ پڑھوا کر سنا۔ ہیرو کی موت، لیکن مزدوروں کی جیت!

کتاب کا کلائمکس مزدوروں کو راس نہیں آیا۔

تمباکو کے پتے کاٹتے ان کی انگلیاں رک گئیں۔

کسی کونے سے شکایت بھری آواز ابھری —

'کیوں مارا کہانی کار نے ہیرو کو؟ جس نے مزدوروں کو جیت دلائی، اسے ہی کیوں مار ڈالا؟'

سب نے اس اعتراض کا ساتھ دیا۔

تلارام کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

خود اس کی آنکھیں بھی ہیرو کی موت سے بھیگ گئی تھیں۔

ہیرو کی لاش کارخانے کے دروازے پر پڑی ہے۔

خون میں لت پت لاش! چہرا بھی مشکل سے پہچان میں آتا ہے۔

دوسری طرف، کارخانے دار کی آواز مائک پر سنائی دے رہی ہے —

'مزدور ہمارے مالک ہیں۔ ہمیں ان کی ساری مانگیں منظور ہیں۔ کل سے کارخانہ کھل جائے گا۔ کسی کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔ کل ہی بڑھی ہوئی در پر بقایا مزدوری دے دی جائے گی۔ ساری مانگیں

مان لی گئی ہیں۔ اب کوئی جھگڑا نہیں رہا۔'

تلارام نے کتاب کی آخری لائنیں پڑھیں، جن میں کارخانے پر مزدوروں کے جھنڈا لہرانے کی بات لکھی تھی، مگر جہاں ہیرو کی خون میں لت پت لاش کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

تلارام کے پاس حالانکہ گھڑی نہیں تھی، مگر وہ انداز سے اتنا ضرور جان گیا تھا کہ اسکول کا وقت ختم ہو گیا ہے، اور اب اسے سیدھے گھر پہنچنا ہے۔

گودام سے نکلتے وقت بھی تلارام نے جھانک کر گلی میں دیکھ لیا۔

جان پہچان کا کوئی آدمی اسے گلی میں آتے جاتے دکھائی نہیں دیا۔

لیکن تیز قدموں سے بھاگتا تلارام جیسے ہی شیر گنج کی چوڑی سڑک پر آیا، اس کی نظر کونے والی شراب کی دکان سے باہر نکل رہے موسا جی پر پڑی۔ نظر پڑتے ہی، تلارام کو ماں کے تیکھے سوال یاد ہو آئے۔

اپنے گھر لوٹنے کی بجائے، تلارام موسی کے گھر کی طرف مڑ گیا۔

اس دن موسی نے سچ مچ تلارام کو کھانے کے لئے روک لیا۔

گھر لوٹتے لوٹتے اسے پھر دیر ہو گئی۔

گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہی اسے باپ کی گرجدار آواز سنائی دی —

'بھلا ہو مدن جیت بابو کا، کہ انہوں نے لونڈے کو گودام گلی سے نکلتے دیکھ لیا، اپنی آنکھوں سے، ورنہ میں تو آج بھی اندھیرے میں ہی پڑا رہتا۔'

تلا رام سکتے میں آ گیا۔ مدن جیت بابو، یعنی موسا جی، جنہیں اس نے اپنی آنکھ سے سڑک کے کونے والی شراب کی دکان سے نکلتے دیکھا تھا!

تلا رام کو سمجھتے دیر نہیں لگی۔

موسا جی نے ہی اس کے بیڑی گودام جانے کی شکایت باپ تک پہنچا دی تھی۔

تنگ سیڑھیوں کی آخری ٹیک پر کھڑے تلا رام کو ایک جھٹکے سے ساری باتیں کچو کے کے ساتھ یاد ہو آئیں!

تلا رام نے سوچا، باپ نے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا تو کیا ہوا۔ باپ ہے، تو کیا اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے لوٹ کر ماں کو ضرور بتانا چاہئے کہ موسا جی نے آج پھر شراب پی ہے۔ اور یہ بھی کہ موسا جی نے آج پھر موسی کی جم کر پٹائی کی ہے۔

تلا رام تنگ سیڑھیاں طے کر کے اپنے گھر لوٹ گیا ہے۔

لیکن میں؟

میں تو اب بھی تلا رام کا نام اوڑھے اس کے گھر کی تنگ سیڑھیوں کی آخری ٹیک پر ہی کھڑا ہوں!

کالے پتھروں کی گپھا

پہاڑی گاؤں کے اس اونچے ٹیلے پر ان دونوں کے بیچ چھوٹا سا، بالکل مختصر سا ایک مکالمہ ہوا تھا۔ میرے لئے اس مختصر سے مکالے کی کوئی خاص اہمیت نہیں بھی ہو تو آپ، جو اس وقت یہ کہانی سن یا پڑھ رہے ہیں، ضرور ہی اسے جاننے کو بے چین ہوں گے۔ آپ کی دلچسپی کی خاطر میں ان دونوں کے بیچ کا وہ مختصر مکالمہ دہراتا ہوں۔

'کیا تلاش رہے ہیں آپ، اس سنگریلی زمین پر؟'

'کچھ خواب، اپنے کچھ ڈراؤنے خواب۔'

'کیسے خواب؟ کہاں ملیں گے یہ، ان کنکروں کے بیچ؟'

'یہیں تو کھوئے تھے، کہیں۔ شاید مل جائیں۔'

بس اتنا سا مکالمہ۔ پھر دونوں ٹیلے کے پچھلے حصے والی ڈھلان کی طرف مڑ گئے تھے۔

دو تین دن بعد، ایک شام جب وہ ریسٹ ہاؤس لوٹے تو ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رومال کی ایک پوٹلی تھی۔

چائے طلب کرتے ہوئے دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔

واپس لوٹے تو چائے کا پاٹ تیار تھا۔

دونوں خاموش تھے۔ چائے پیتے وقت، مجھے اچھی طرح یاد ہے، ان کے بیچ کوئی مکالمہ نہیں ہوا۔ صرف ایک بار ان میں سے ایک نے برآمدے والی کھڑکی بند کر دینے کا اشارہ کیا تھا۔ کھڑکی سے سرد ہوا کے جھونکے آنے لگے تھے۔ اس وقت ان کے بدن پر گرم کپڑے نہیں تھے۔

چائے پی کر وہ دوبارہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ریسٹ ہاؤس کا خانساماں سورین جانتا تھا، اب وہ دونوں دس بجے کے قریب کھانے کی میز پر ہی ملیں گے۔ اس لئے وہ بھی مطمئن ہو کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ لیکن اس کا دھیان اب تک اس پوٹلی پر ہی ٹکا تھا۔ کیا چیز ہو سکتی ہے، اس میں۔ کیا کچھ پہاڑی پھول، یا جڑی بوٹیاں، جن کے لئے پہاڑی گاؤں کا یہ ٹیلہ اور آس پاس کے جنگلی علاقے مشہور تھے۔

سورین نے سر جھٹک کر جڑی بوٹیوں کی بات دماغ سے نکال دی، اور پھولوں کی بھی۔ ایسا ہوتا تو دونوں نے اس سے اس بابت ضرور پوچھا ہوتا۔ لیکن وہ تو صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ پہاڑی ٹیلے کا وہ حصہ کون سا ہے، جہاں کے پتھر سب سے نکیلے اور چمکدار ہوتے ہیں۔ اور جن کو رگڑنے سے آگ کی چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں۔

کئی کئی صبح سورین انہیں وہ جگہ دکھانے لے گیا، جہاں عام طور پر سیلانیوں کی نظریں نہیں جاتیں۔ یا پھر سنسان ہونے کے سبب وہ ادھر کا رخ نہیں کرنا چاہتے۔ ایک اجنبی خوف انہیں روک لیتا تھا۔

سورین کو یاد تھا، ایک بار کوئی نیا جوڑا رو میں گھنے پیڑوں سے گھرے اس اندھیرے حصے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس وقت ریسٹ ہاؤس کے عملوں پر جیسے شامت آ گئی تھی۔

سورج ڈوبنے تک ان کا کوئی پتہ نہیں چلنے پر پڑوس کے گاؤں سے کئی لوگوں کو بلا کر علاقے بھر میں انہیں ڈھونڈا گیا تھا۔ آدھی رات کے قریب، گھنے پیڑوں کے نیچے، انہیں نیم بے ہوشی کی حالت میں گاؤں والوں نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان پر عجیب ڈراؤنا پن طاری تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں انہیں کوئی دیسی دوا پینے کو دی گئی تھی۔ تب جا کر، کئی گھنٹے کے بعد، ان کے ہوش ٹھکانے آئے تھے۔

اس واقعہ کے بعد سے سیلانیوں کا ادھر جانا لگ بھگ بند ہو گیا تھا۔

سرکاری عملوں نے بھی ممانعت کے حکم جاری کئے تھے۔

تو پھر یہ دونوں وہاں سے رومال کی پوٹلی میں کیا لے کر آئے ہوں گے، سورین نے سوچا۔ جب وہ ریسٹ ہاؤس سے نکلے تھے تو ان کے گلے میں کیمرہ تھا، اور چھوٹی چھوٹی دو نوٹ بک تھی۔ بس، یہی کچھ تھا۔ پھر وہ رومال میں باندھ کر کیا لائے تھے!

سورین اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کچن سے کسی نے آواز دی —

'کھانا نہیں بنانا ہے کیا؟' کیئر ٹیکر مرمورات کی ڈیوٹی پر آ گیا تھا۔

کھانا بناتے وقت بھی سورین کے دماغ میں وہ پوٹلی گھومتی رہی۔ کیا چیز ہو سکتی ہے اس پوٹلی میں کہ جسے وہ اتنی حفاظت سے لائے تھے اور سب کی نظر سے بچا کر کہیں رکھ آئے تھے۔ خواہش تو اس کی ہوتی تھی کہ کسی بہانے ان کے کمرے میں جا کر خود اپنی آنکھوں سے تسلی کر لے۔ لیکن یہ تبھی ممکن تھا جب وہ وہاں نہ ہوں۔ اس وقت تو دونوں اپنے کمرے میں تھے اور دن بھر کے اپنے تجربے لکھنے میں مصروف۔ شاید سویرے کی چائے دیتے وقت یا پھر کمرے کی صفائی کراتے وقت وہ یہ کام کر سکتا تھا۔

کھانے کی میز پر دونوں تقریباً خاموش ہی رہے۔ کوئی خاص مکالمہ ان کے بیچ نہیں ہوا۔ انگلیوں

کے اشارے سے ہی انہوں نے ایک دوسرے سے پھل یا سلاد کی پلیٹیں مانگیں۔

سورین پاس کھڑا ان کے چہرے پر چھائی اسرار کی پرتیں بھانپتا رہا۔

کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر لان میں ٹہلتے رہے۔ شاید اگلے دن کا پروگرام طے کرنے کے بارے میں ان کے بیچ کوئی مکالمہ ہوا ہو۔ لیکن بے فکر ہو کر یہ بات نہیں بھی کہی جا سکتی۔ جب وہ لان میں ٹہل رہے تھے، ان کے کمرے کھلے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے سورین کو خیال آیا، کیوں نہیں وہ دیکھ ہی آئے آخر اس پوٹلی میں کیا ہے۔ سونے سے پہلے اس کی تشویش تو کم سے کم دور ہو جائے گی۔ لیکن اسے ایسا کرنا ٹھیک نہیں لگا۔ رومال کھول کر دیکھنے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ اسی بیچ وہ اندر آ گئے تو اس کے تئیں ان کا دو ہفتے میں پیدا اعتماد ایک دم سے ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ پھر تو وہ اپنے مہمانوں سے نظریں بھی نہیں ملا سکے گا۔

یہی سوچ کر سورین نے ان کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ویسے بھی اس کا اندیشہ صحیح تھا۔ دونوں کچھ ہی دیر میں لان سے لوٹ آئے تھے۔

اس بار وہ سیدھے اپنے کمرے میں جانے کی بجائے باہر والے برآمدے میں بینت کی کرسیوں پر ہی بیٹھ گئے۔ ایک بار انہوں نے سورین کو آواز دے کر کافی لانے کو کہا۔ کافی کی ٹرے لے کر سورین آیا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دونوں کے بیچ بات چیت کا سلسلہ جاری تھا۔ آج دن بھر میں شاید پہلی یا دوسری بار۔

سورین کو ان کی بات چیت سننے کی بے چینی تھی۔ شاید رومال کا راز ان کی بات چیت میں کھل جائے۔ اس لئے کافی دے کر وہ دروازے سے لگے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ ان کی باتیں بخوبی سن سکتا تھا۔ دونوں دبی زبان میں ہی باتیں کرنے کے عادی تھے۔

'آخر اتنے دن ہو گئے، تم یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو، یہ انہیں کی ہیں۔'

'میں کہہ سکتا ہوں، یقین کے ساتھ، کیوں کہ میں نے مما کی ڈائری پڑھی ہے، ایک ایک لفظ پڑھا ہے، اس کا۔ اس نے جو جگہ لکھی ہے، اپنی ڈائری میں چٹان کے نیچے والی جس گپھا کا ذکر کیا ہے، تم نے دیکھا نہیں، یہ وہیں سے ملی ہیں۔ مما نے لکھا ہے، اس نے کالے سلیب والی گپھا میں ہی انہیں رکھ دیا تھا۔ کالا سلیب، یعنی کالے پتھروں والی سطح۔ پھر اس نے سطح پر ڈھیر سارے نکیلے پتھر ڈال دیئے تھے۔ مما نے یہ بھی لکھا کہ نکیلے، چمکدار پتھروں کے رگڑنے سے آگ کی چنگاری پیدا ہو رہی تھی، اور کچھ شور بھی گونجا تھا۔ آگ کا شور اس نے اس سے پہلے نہیں سنا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے آگ سے پیدا ہونے والا شور کبھی نہیں سنا۔ تمہیں یاد ہے نا، میں نے ریسٹ ہاؤس آتے ہی سورین سے پوچھا تھا، وہ جگہ کون سی ہے جہاں سب سے زیادہ چمکدار اور نکیلے پتھر پائے جاتے ہیں۔ پتھر، جن کے رگڑنے سے آگ کی چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یقین مانو، یہ وہی گپھا ہے، جہاں مما نے برسوں قبل انہیں کالے پتھروں کی گود میں چھپا دیا تھا۔'

'چلو مانے لیتی ہوں۔ لیکن یہ تو کہانی کا ایک چھوٹا سا ہی حصہ ہے۔ تم نے کہا تھا، ایک بار وہ جگہ مل جائے اور وہ چیز، جس کی تمہیں اس قدر تلاش رہی ہے، تو تم مجھے کہانی کا اصلی حصہ ضرور سناؤ گے۔ کہا تھا نا۔'

'ہاں، ضرور کہا تھا۔ ضرور سناؤں گا تمہیں وہ کہانی جو ان تمام برسوں میں میرے دماغ میں آگ کی بھٹی کی طرح سلگتی رہی ہے۔ لیکن اس وقت نہیں۔ کیا بہت رات نہیں ہوگئی، پہلے ہی۔ کل بھی تو ہمیں صبح سویرے ہی نکلنا ہے۔ چلو اب آرام کریں، باقی باتیں کل ہوں گی۔'

دونوں اٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ہی سورین بھی اٹھ گیا۔ لیکن اس کا دل پہلے سے زیادہ متفکر تھا۔ پوٹلی کا راز جاننے کی اس کی خواہش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ صبح کے انتظار کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ

نہیں تھا۔

لیکن سورج اُگنے سے پہلے، پہاڑ کا موسم اچانک کچھ اس طرح بدلا کہ آسمان نہ صرف بادلوں سے گھر گیا بلکہ موسلا دھار بارش بھی ہونے لگی۔ پورے دن یہی حال رہا۔ بارش ذرا دیر کے لئے بھی نہیں رکی۔ ہوا میں ٹھنڈک کا اثر تیز ہو گیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔

دونوں دن بھر شال میں لپٹے برآمدے میں بیٹھے رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر سورین چائے کافی دیتا رہا۔ شام ہونے کو آ گئی، اور بارش کے رکنے کے آثار ختم ہو گئے تو وہ برآمدے سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

چھوٹے سے ڈرائنگ روم کے ایک کنارے کچن کا دروازہ کھلتا تھا۔ سورین رات کے کھانے کی تیاری میں لگا تھا۔ لیکن اس کا دھیان ڈرائنگ روم میں چل رہی بات چیت پر لگا تھا۔

مکالمے کی جو کتاب انہوں نے پچھلی رات بند کر دی تھی، وہ اس وقت ان کے سامنے کھلی پڑی تھی۔

'میں تو رات ہی کہہ چکی، میں نے مان لیا یہ جگہ وہی ہے، اور کالے پتھروں کے بیچ بڑی حفاظت سے رکھی نشانی بھی انہیں کی ہے۔ لیکن اس سے اصلی کہانی کہاں کھلتی ہے۔ مجھے دراصل وہی جاننے کی خواہش ہے۔'

'ممانے اپنی ڈائری میں لکھا تھا، ریسٹ ہاؤس کے دونوں کمرے اس بار ہمارے لئے ہی بک تھے۔ ایک ہم دونوں کے لئے، دوسرا ان کے ایک اخباری دوست کے لئے۔ ہم وہاں صرف تین راتیں گزارنے آئے تھے۔ دفتر کی طرف سے ہمیں پتھروں کے کچھ خاص نمونے اکٹھا کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ پہلے دو دن ہم پہاڑی ٹیلے اور آس پاس کے جنگلی علاقوں میں گھومتے رہے تھے۔ لیکن ہمیں وہ جگہ نہیں ملی جہاں کے پتھر سخت، نکیلے اور چمکدار بتائے گئے تھے، اور جن کے رگڑنے

سے آگ کی لپٹیں نکلتی تھیں۔ تیسرے دن، صرف ہم دونوں پتھروں کی تلاش میں ٹیلے کی طرف نکلے۔ ان کا اخباری دوست ریسٹ ہاؤس میں ہی رکا رہا۔ اسے شاید کوئی رپورٹ فائل کرنی تھی، اسی روز۔'

'ممانے آگے لکھا تھا، دن بھر کی مشقت کے بعد ہم وہ جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب رہے تھے۔ تیز چمکدار، نکیلے پتھروں والی جگہ، جہاں اوپری سطح کی کنکریلی مٹی ہٹاتے ہی کالے رنگ کے چمکدار پتھر صاف نظر آنے لگے تھے۔ جلدی جلدی ہم نے پتھروں کے نمونے جمع کیے۔ ہمارے بیگ پتھروں سے بھر گئے تھے، اور کسی قدر روزنی بھی۔

ہم لوٹنا ہی چاہتے تھے کہ سمیر نے دھیمی آواز میں رک رک کر مجھ سے کہا، 'تھرمس میں شاید تھوڑی کافی بچ رہی ہو...... پی کر چلتے ہیں۔'

'کافی پیتے پیتے وہ کالے پتھروں والی گپھا میں میرے بالکل قریب آ گیا۔ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کچھ کچھ گھبرائی سی آواز میں اس نے کہا، 'روہت...... تمہیں کیسا لگتا ہے...... میرا مطلب...... دلچسپ آدمی ہے......'

'لیکن تم مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟'

'نہیں...... یوں ہی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا، اس نے میرے تمام کاموں کی اچھی طرح اسٹڈی کی ہے۔ ایک لمبی رپورٹ بھی اس نے پہاڑ پر میرے ریسرچ کو لے کر لکھی ہے۔ آج ہی شاید وہ اسے بھیجنے والا ہے۔ دو تین قسطوں میں چھپے گی۔ کہہ رہا تھا، رپورٹ کے چھپنے پر اس سال کا نیچر ایوارڈ مجھے ہی ملے گا۔ کالے پتھروں کی کھوج سے اس کا امکان اور بڑھ گیا ہے۔'

'وہ تو صحیح ہے، لیکن تم...... کہنا کیا چاہتے ہو......؟'

'نہیں، کچھ نہیں۔ کل سویرے ہم واپس لوٹ چلیں گے۔ آج رات ...... کیا تم ...... تھوڑا وقت ......
رو...... ہت کے ساتھ گزار سکتی ہو؟ وہ کہتا تھا...... تم...... اسے...... بہت اچھی...... لگتی ہو......'

مما نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا، اس کے آگے وہ اور کچھ نہیں سن پائی۔

کافی کا پیالہ اور تھرمس سمیر کے ہاتھوں میں تھما کر مما بولی، تم ریسٹ ہاؤس چلو، میں آتی ہوں۔

اس کے جانے پر وہ دیر تک کالے پتھروں والی اس گپھا میں بیٹھی رہی۔ تیز، نکیلے چمکدار کالے پتھروں کے بیچ، جن کے آپس میں ٹکرانے سے آگ کی چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں، اور اندھیری راتوں میں بھی روشنی کے دھماکے سنائی پڑتے ہیں۔

مما لوٹ کر ریسٹ ہاؤس نہیں گئی۔ ڈھلان کے نیچے اتر آئی۔

محکمہ جنگلات کے کسی افسر کی جیپ سے اس نے شہر کی لفٹ مانگی۔

افسر نے مما کی کلائیوں سے خون بہتا دیکھ کر اسے آگے کی سیٹ دے دی اور اپنے رومال سے اس کے زخمی ہاتھوں پر پٹی بھی باندھ دی۔

'کیسے ہوا یہ؟' افسر نے پوچھا۔

'بس ذرا پھسل گئی تھی۔ نکیلے پتھروں پر ہتھیلیوں کے بل گر گئی۔ کوئی خاص چوٹ نہیں ہے۔ آپ نے لفٹ دی، اس کا شکریہ۔'

میں ان دنوں دہرادون کے ایک بورڈنگ اسکول میں تھا۔ چھٹیوں میں گھر آنے پر دیکھا، مما کا گھر بدل گیا ہے اور وہ تنہا ہیں۔ پاپا سے ان کا کوئی رشتہ نہیں رہ گیا ہے۔

پوری پڑھائی کے دوران، میں نے مما سے کبھی نہیں پوچھا وہ اکیلی کیوں ہیں۔ پاپا سے ان کے رشتے کیسے ٹوٹے۔ سوچتا ہوں، پوچھتا بھی تو شاید وہ میرے سوال کا جواب خاموشی سے ہی دیتیں۔

لیکن پڑھائی ختم کر کے جب میری اس محکمے میں نوکری ہوئی اور میں اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں اس پہاڑی گاؤں کی طرف آنے کو ہوا، تو اچانک مما نے الماری سے اپنی ڈائری نکال کر مجھے دی۔ اس ڈائری میں ریسٹ ہاؤس کے ان تین دنوں کی کہانی درج ہے، ابھی میں نے تم سے جس کا ذکر کیا ہے۔'

سورین اس سے آگے اپنا صبر وضبط بنائے نہیں رکھ سکا۔

تقریباً بھاگتا ہوا وہ ان کے کمرے میں گیا۔

بے چین نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے پر اسے بستر میں تکیے کے نیچے رومال کی وہ پوٹلی دکھائی دی۔

ایک جھٹکے میں اس نے پوٹلی کھول دی۔

سورین کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

بستر پر کانچ کی رنگین چوڑیوں کے بے شمار ٹکڑے بکھرے پڑے تھے!

آخری خط

تمہارے نام یہ میرا آخری خط ہے۔ آج کے بعد میں تمہیں کوئی خط نہیں لکھ سکوں گا۔ چاہوں تو بھی نہیں۔ جتنے خط میں نے آج تک تمہیں لکھے ہیں، سب اسی شہر میں رہتے رہتے لکھے ہیں۔ ایک بھی خط کہیں اور سے نہیں لکھا۔

ان خطوں میں کتنے ڈاک کے سپرد ہوئے، مجھے ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں۔ کتنے تمہارے ہاتھوں تک پہنچے، اس کا بھی کوئی حساب مجھے نہیں معلوم۔

خطوں کی رسید بھیجنے میں تمہارا یقین ہوتا تو میں شاید ان باتوں پر کوئی روشنی ڈال سکتا۔

میں نے اوپر کہا کہ تمہارے نام یہ میرا آخری خط ہے۔ دراصل، اس شہر میں میری زندگی کا یہ آخری دن ہے۔ کل میں اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ کہاں چلا جاؤں گا، تم اگر پوچھنے کی زحمت اٹھاؤ بھی تو شاید میں خود نہیں بتا پاؤں گا۔

لیکن کوئی یہ سوال مجھ سے پوچھے گا ہی کیوں!

آج میرے دل پر ایک عجیب بے یقینی چھائی ہے، اس شہر کا یہ آخری دن کیسے گزاروں۔ اور پھر اس شہر کی یہ آخری رات۔ دن گزارنے کی تفصیل جاننے میں شاید تمہاری دلچسپی نہیں ہو۔ گھر سے کالج جانے اور پھر گھر لوٹنے تک کا بیورا تمہیں یا کسی کو بھی کون سی راحت دے سکے گا۔

میں مان لیتا ہوں کہ اس شہر کا اپنا یہ آخری دن میں نے کس طرح گزارا، اس میں تمہاری دلچسپی نہیں، لیکن، رات! ہاں رات کی تفصیل جاننے میں شاید تمہاری دلچسپی ہو۔

دراصل میرے تمہارے بیچ برسوں برس پنپنے والے رشتوں میں رات کی تنہائیوں نے جو رول ادا کیا ہے، کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ سو، تم شاید ضرور ہی یہ جاننا چاہو کہ اس شہر کی یہ آخری رات میں نے کیسے اور کہاں گزاری۔

چونکہ کل مجھے اس شہر میں نہیں رہنا، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس شہر کی سرحدوں کو چھوڑ کر کہیں آگے چلا جانا ہے، کہاں، یہ اس وقت خود مجھے نہیں معلوم، اس لئے میری خواہش ہوتی ہے کہ اس شہر میں گزری اپنی اس آخری رات کی تفصیل تم سے ضرور بیان کردوں۔

تم کو یاد ہوگی اس شہر کے ایک کنارے ندی پاس کی وہ ریتیلی زمین، جہاں شانت لہروں کی تھپکیوں کے بیچ ہم اور تم کئی کئی بار ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کو نہارا کئے ہیں۔ پانی کی لہروں کا کوئی بے ادب ریلا کبھی کبھی ہمارے بہت قریب آکر ہمیں اچھی طرح بھگوتا رہا ہے، تمہیں یاد ہے نا؟ پھر ہم دیر تک اپنے کپڑوں پر چپل گئی بھیگی ریت کو ہٹاتے رہے ہیں۔ ریت کبھی بدن اور ہمارے کپڑوں سے اڑ کر ہمارے چہروں پر بیٹھ جاتی رہی ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لئے بے چین سے ہوتے رہے ہیں۔

وہیں، ندی پاس کی اسی ریتیلی زمین پر اس شہر کی اپنی یہ آخری شام، یا شاید یہ آخری رات، گزارنے کی خاطر میں یہاں آیا ہوں۔

میری آنکھوں کے سامنے اس شہر کی اس آخری شام کا آخری سورج ڈوبنے ڈوبنے کو ہے۔

اس وقت جب کہ میں اس آخری سورج کے ڈوبنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، میرے

ذہن میں تمہارے ساتھ دیکھے گئے سورج کے ڈوبنے کے پچھلے سارے منظر بجلی کی طرح کوندھ رہے ہیں۔

اس وقت جب میں اس شہر میں اپنی یہ آخری رات گزارنے ندی پاس کی ریتیلی زمین پر بیٹھا ہوں، میرا ارادہ ہرگز نہیں ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں گزاری اپنی انگنت شاموں کی کیفیت دوبارہ تم پر ظاہر کروں۔ ممکن ہے، تم ان شاموں کی اداسی میں دوبارہ سانسیں لینا نہیں بھی چاہو، لیکن مجھے یہاں تمہاری نہیں صرف اپنی بات کہنی ہے۔ اس لئے میں کیوں چاہوں گا آخر کہ انگنت شاموں کی طرح اس شہر میں گزرنے والی میری اس آخری شام میں ماضی کی تصویروں کے بیچ تمہاری آنکھیں دوبارہ نم ہو جائیں، یا تمہاری آنکھوں سے ٹپکنے والی کھارے پانی کی بوندیں پھر سے میرے احساس کی تپتی ریت پر گر کر بکھر جائیں۔

لیکن میرے اس خط میں جو تمہارے نام اس شہر سے لکھا گیا میرا آخری خط ہے، اگر تمہیں میری کچھ تلخ یادوں کی پرچھائیاں نظر آ جائیں تو ان کا برا نہیں ماننا۔ بس انہیں میری طرف سے تمہارے نام لکھا گیا آخری خط سمجھ کر نظر انداز کر دینا۔ اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں، یہی میری تم سے التجا ہے۔

جیسا میں نے آگے کہا یا لکھا، میں جہاں بیٹھا ہوں، میرے سامنے اس شہر کا آخری سورج بس کچھ منٹوں میں ہی ڈوبنے والا ہے۔ اس کی لال سرخ کرنیں بس کچھ لمحوں میں ہی ندی کے اس کنارے، دور دور تک پھیلے ہرے بھرے کھیتوں کی گود میں چھپ جائیں گی۔ میں جانتا ہوں، مجھے سورج کے ڈوبنے کا یہ منظر بے چین کر دے گا، کیوں کہ اس شہر کی اس آخری شام میرے ساتھ کوئی نہیں ہوگا، جو اس ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کو غائب ہوتے دیکھ کر اپنی ہتھیلیوں سے میری آنکھیں ڈھک لے۔

'لوگ کہتے ہیں، سورج کو اندھیری کھائی میں گرتے دیکھنا اشبھ ہے۔'

اپنی ہتھیلیوں سے میری آنکھیں ڈھکتے وقت اکثر تمہاری زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے ہیں۔

'اندھیری کھائی میں کہاں گرتا ہے سورج! وہ تو بس ایک کروٹ لے کر ہرے بھرے کھیتوں میں اُگی فصلوں کے بیچ چھپ جاتا ہے، کچھ گھنٹوں کے بعد دوبارہ اپنا سفر شروع کرنے کے لئے۔ سورج کی اس کروٹ کو اشبھ کیسے کہیں گے؟'

مجھے یاد ہے، میں اکثر کچھ انہیں الفاظ میں تمہاری باتوں کو رد کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

تمہاری ہتھیلیاں پھر بھی میری بے چین آنکھوں کو ڈھکے رہتی ہیں۔

ایک بار، شاید تمہیں یاد ہو، آسمان پر چھائے بادلوں کے ایک آوارہ ٹکڑے نے کھیتوں کی گود میں گرتے سورج کو پوری طرح اپنی مٹھیوں میں بند کرلیا تھا۔ ہم دونوں کچھ لمحوں کے لئے کانپ گئے تھے۔ ہمارے شہر کا سورج ڈوبنے کے پہلے ہی کالے دھبوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔

اس دن تم نے اپنی ہتھیلیوں سے میری آنکھوں پر سایہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہم اور تم، دونوں خاموش، آسمان کے اس حصے کی طرف دیکھتے رہے تھے، جہاں آوارہ بادلوں نے سورج کو اپنے اندھیرے سے ڈھک لیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم، اس دن اور کیا ہوا تھا، لیکن میری اور تمہاری آنکھوں نے کچھ لمحوں کے بعد ہی دیکھا کہ سورج آوارہ بادلوں کی مٹھی سے نکل کر دوبارہ آسمان اور زمین جہاں ملتے ہیں وہاں دور دور تک پھیل گیا اور اس کی لال سرخ کرنوں نے پورے افق کو اپنے وسیع دائرے میں سمیٹ لیا۔

تمہارے لئے یہ منظر دیکھ کر اپنی حیرانی اور خوشی روک پانا مشکل تھا۔ بے تحاشہ تم نے اپنی مٹھیوں میں ریت بھر لی تھی۔ تمہارے تیز قدم ندی کی لہروں پر سوار ہو کر وہاں پہنچ گئے تھے، جہاں پانی کی دھار سب سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور جہاں ندی کی گہرائی ناپنے میں تجربہ کار مچھوارے بھی کبھی کبھی

دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

اس دن میں نے حیران ہو کر تمہیں ندی کی لہروں سے کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ تمہارے چہرے پر ہمیشہ نظر آنے والی مسکراہٹ ایک معصومیت بن کر ابھر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، ندی کی گہرائی میں اپنے پیر جمائے تم نے اپنے دونوں ہاتھ افق کی جانب پھیلائے، اپنی مٹھیاں کھولیں اور ریت کے ذرّوں کو ہوا میں اچھال دیا۔

تمہاری مٹھیوں میں بند ریت کے ذرّے تھوڑی دیر ندی کی فضاؤں میں اڑتے رہے۔ تمہاری آنکھیں فضاؤں میں تیرتے ریت کے ذرّوں کو نہارتی رہیں۔ ضرور ہی تم نے ان ذرّوں کو ندی کی لہروں پر گرتے دیکھا ہوگا۔

لیکن اس دن جب تمہارے قدم میرے پاس لوٹے، تمہاری آنکھیں ایک نئے حوصلے کا پتہ دے رہی تھیں۔

'دیکھو، آج سورج نے گھنیرے بادلوں سے باہر نکل کر ایک نئی زندگی کا پتہ دیا ہے۔ میری مایوسیاں ختم ہوگئی ہیں۔ ہم اور تم اس نئی زندگی کی راہ میں ایک ساتھ چلیں گے۔ ہمارے بیچ اور کوئی نہیں آئے گا، کوئی نہیں۔'

تمہیں یاد ہوگا، تم نے جب ایسا کہا، میں نے تمہارے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دی تھیں۔ وقت اس دن جیسے ٹھہر گیا تھا۔ سورج کی لال سرخ کرنیں دیر دیر تک افق پر چھائی رہی تھیں۔ ندی کے اس کنارے، دور دور تک پھیلے، فصلوں کی خوشبوؤں سے مہکتے کھیتوں کو اس شام دیر تک سورج کے زمین پر اترنے کا انتظار کرنا پڑا تھا۔

وہی سورج، تھوڑی دیر بعد، اس شہر میں میری اس آخری شام، آج پھر ڈوبنے ڈوبنے کو ہے۔ ندی

پاس کی ریتیلی زمین پر بیٹھا بیٹھا میں اس شہر میں اپنی آخری شام، اور شاید آخری رات، گزارنے کی بات سوچ رہا ہوں۔

ندی پوری طرح خاموش ہے۔ اس وقت اس کی لہروں میں کوئی ہلچل نہیں۔ دیکھو، کتنی دیر سے میں ندی پاس کی اس ریتیلی زمین پر پسرا ہوں، لیکن ندی کی کوئی ایک لہر، بھولے بھٹکے بھی، میرا بدن بھگونے نہیں آئی۔ میرے ننگے پیروں سے لپٹے ریت کے ذرے مجھے اپنی تپش کا احساس کراتے ہیں۔ میری آنکھیں آسمان کے اس حصے پر ٹکی ہیں، جہاں آسمان زمین کو گلے لگاتا ہے اور جہاں اس شہر کا سورج اپنے تکان بھرے سفر کے بعد، دور تک پھیلے کھیتوں کی خوشنما فصلوں کی گود میں چھپ جانے کے ہر ممکن جتن کرتا ہے، اور جہاں اوس کی مخملی چادر اس کے تپتے بدن کو پوری طرح ڈھک لیتی ہے۔

میں نے اچھا نہیں کیا کہ تمہیں اس شہر کی آخری رات کسی تپتے بدن پر پھیلی مخملی چادر کی یاد دلا دی۔ وہ کسی ڈوبنے والے تنہا سورج کا تپتا بدن نہیں ہے، جسے اوس کا مخملی آنچل اپنی سلوٹوں میں چھپا لیتا ہے۔

تمہیں یاد ہوگا، ضرور ہی یاد ہوگا، کہ بدن تو سورج کے علاوہ ہمارے بھی تپتے رہے ہیں۔ ہماری سانسیں بھی سورج کی لال سرخ کرنوں کی طرح ندی پاس کی ریتیلی زمین پر بکھرتی رہی ہیں۔ ہم بھی، اکثر ندی کی تیز بہتی دھار کو اپنی بیتاب ہتھیلیوں سے روکتے ہوئے اپنے چہروں پر کچھ چھینٹیں ڈالتے رہے ہیں۔ اسی طرح، جیسے سورج اوس کی بوندوں سے اپنے چہرے پر پھیلی تپش دور کرتا ہے۔

لیکن اس شہر سے تمہارے نام لکھے اس آخری خط میں اپنے تپتے بدن پر پانی کی چھینٹوں کا اس طرح

ذکر کرنے کے پیچھے میرا مقصد کیا ہے؟ میں تو اس خط میں صرف اپنی بات لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میری نظریں لگا تار ندی پار زمین کے اس حصے پر ٹکی ہیں، جہاں بس کچھ منٹوں میں ہی سورج آسمان سے اترنے والا ہے۔ پھر میں اپنے ارادے سے ہٹ کر اپنے اور تمہارے ایک ساتھ گزارے لمحوں کا ذکر اس خط میں بار بار کیوں کر رہا ہوں؟ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔

ہوسکتا ہے، بلکہ ضرور ہی ایسا ہوگا، کہ تمہیں اس طرح اس خط میں اپنے اور میرے ذکر سے کچھ الجھن سی محسوس ہو رہی ہو۔ ہو بھی تو کیا! میں کسی منصوبے یا مقصد کے تحت تو ایسا نہیں کر رہا۔ اپنی بات کہتا ہوں تو بے جھجک تمہاری باتیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بالکل ان سانسوں کی طرح، جنہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی تمام کوششیں ہمیشہ بے اثر ہوتی ہیں۔

دیکھو، سورج کے ڈوبنے میں اب بس کچھ ہی لمحے بچ رہے ہیں۔ تم نے ندی پاس کی اس ریتیلی زمین پر بیٹھے لیٹے، کئی کئی بار، اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے۔ دیکھو، پرندے جھنڈ بنا کر ندی کے اس پاس سے اس کنارے کی طرف جا چکے ہیں۔ انہیں پتہ ہے، تھوڑی دیر میں سورج کی لال سرخ کرنیں ہرے بھرے کھیتوں کی تہوں میں گم ہو جائیں گی۔ اور ندی کے سینے پر رات کی تاریکی کا شامیانہ تن جائے گا۔

ہم اور تم کئی کئی شامیں ایک ساتھ اس شامیانے تلے گزار چکے ہیں۔ اس لمحہ جبکہ میں تمہیں اپنا یہ آخری خط لکھ رہا ہوں، میرے دل میں اور شاید تمہارے دل میں بھی، ان ایک ساتھ گزارے لمحوں کی یادیں بالکل ہی تازہ ہوں گی۔ وقت کی کوئی نامہرباں پرچھائی بھی ان یادوں کی تازگی کو چھو نہیں پائی ہے۔

سورج کے ڈوبنے میں ابھی شاید کچھ دیر ہے۔ اس کی لال سرخ کرنیں آسمان کے ایک خاص حصے

میں آ کر ٹھہر گئی ہیں۔ ان کے نیچے اترنے اور زمین کی گود میں چھپ جانے کی رفتار دھیمی پڑ گئی ہے۔

'ڈوبتے کیوں نہیں سورج! ندی اس پار فصلوں سے بھرے کھیتوں کی گود کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ پرندوں کے جھنڈ کب کے ندی اس کنارے اپنے گھونسلوں کی طرف جا چکے ہیں۔ رات کی تاریکی ندی کے سینے پر اپنا شامیانہ کھڑا کرنے کو بیتاب ہے۔ اور تم ہو کہ ڈوبتے نہیں۔ ڈوبتے کیوں نہیں، میرے شہر کے سورج!

میری زبان سے یہ الفاظ ادا نہیں ہوئے۔ لیکن تم کو تو پتہ ہے، سورج تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے الفاظ کا ادا کرنا ضروری نہیں۔ تم ہی کہو، میری آواز سورج تک پہنچی نا!

نیند سے بوجھل ہوتی اپنی آنکھوں کو زندہ رکھنے کے لئے میں ان آنکھوں میں قرینے سے سجا کر رکھے انگنت سپنوں کو کریدنے کی کوشش کرتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں، میں تمہیں ان سپنوں کی یاد نہیں دلاؤں گا۔ ان سپنوں کی بھی نہیں، جو میں نے اکیلے نہیں دیکھے ہیں۔

میں سپنوں کی دنیا میں ہی ہوں کہ مجھے ندی کی خاموش لہروں پر یکا یک کچھ ہلچل سی ابھرتی محسوس ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں، اس شہر میں میری یہ آخری رات گزر رہی ہے۔ کل میں اس شہر کا حصہ نہیں رہوں گا۔ اس لئے میں اب یہاں اس ندی کی لہروں پر اچانک ابھرنے والی ہلچل سے اپنے آپ کو بالکل الگ رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں ریتیلی زمین پر پسرے پسرے اپنی آنکھیں ڈوبتے سورج سے ہٹا کر ندی کی لہروں کی طرف دیکھنے کو مجبور ہوں۔

میری آنکھیں دیکھتی ہیں، ایک ناؤ، دھیمے دھیمے، ندی کی لہروں پر بہتی، جہاں میں ریتیلی زمین پر اپنی آنکھیں کھولے پڑا ہوں، وہیں آ کر رک جاتی ہے۔

میرے سپنوں کی کڑیاں یکا یک ٹوٹ رہی ہیں۔ کانچ کے ٹکڑوں کی طرح، وہ ندی کے پاس کی

ریتیلی زمین پر بکھر رہی ہیں۔

میں دیکھتا ہوں ایک سفید کایا ناؤ کے بیچ سے ابھر کر ندی کے پاس کی ریتیلی زمین پر اپنے پاؤں رکھتی ہے۔ جہاں میں اس زمین پر پسرا ہوں، وہاں سے بس تھوڑی دور۔

میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ ندی پہلے جیسی شانت ہوگئی ہے۔ اس کی ہلچلیں تھم گئی ہیں۔

سورج اب بھی وہیں ٹکا ہے، جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے ٹکا تھا۔ اس کی لال سرخ کرنیں اب بھی کھیتوں کی سیج سے دور ہیں۔ رات اب بھی اپنے ہاتھوں میں تاریکیوں کا شامیانہ تھامے کھڑی ہے۔

تمہارے نام میرا یہ آخری خط ہے، جو میں اس شہر میں اپنی اس آخری شام لکھ رہا ہوں۔ کل میں اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ کہاں جاؤں گا، اس وقت خود مجھے نہیں معلوم۔ تم مجھ سے پوچھنا بھی چاہو تو اس وقت میرے پاس تمہارے اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔

گھبراؤ نہیں، آج کے بعد تمہیں کوئی ندی پاس کی اس ریتیلی زمین پر اپنے ساتھ گزارے لمحوں کی یاد نہیں دلائے گا۔

لیکن ناؤ سے اتر کر ننگے پاؤں ریت پر چلتی ہوئی میرے قریب آنے والی یہ سفید کایا کس کی ہے؟ کون ہے، جس نے میرے قریب، بالکل قریب آ کر اپنی ہتھیلیوں سے میری آنکھیں ڈھک لی ہیں۔

'سورج کو اندھیری کھائی میں گرتے دیکھنا اشبھ ہے، لوگ کہتے ہیں۔'

میرے کانوں میں کوئی آواز گونج رہی ہے۔

میری آنکھوں سے تمہاری ہتھیلیوں کا سایہ ہٹ گیا ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں، سورج کی لال سرخ کرنیں ہرے بھرے کھیتوں کی گود میں چھپ گئی ہیں۔

اوس کی مخملی چادر نے سورج کے تپتے بدن کو پوری طرح ڈھک لیا ہے۔

ہر روز کی طرح، آج پھر ندی کے سینے پر رات کا شامیانہ تن گیا ہے!

لمحے

گھاٹ سے لوٹ کر میں نے ماں جی کے دیئے دونوں پوسٹ کارڈ نکالے۔
ان پر ماں جی کی وفات کی تاریخ لکھی۔
یہ بھی لکھا کہ انہیں آگے ماں جی کے لئے پیسے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

ہاں، لکھتے وقت میں یہ لکھنا نہیں بھولا کہ ماں جی کی چتا کو آگ میں نے دی ہے۔

ڈاک گھر میں ماں جی کے دونوں بیٹوں کے نام لکھے پوسٹ کارڈ گرا کر میں نے اپنی ڈائری کے صفحے کھولے۔

شاید ہم کافی ڈر گئے ہوں، ہمارے پاس انڈرگراؤنڈ تحریک کے ادب کا ذخیرہ تھا، جسے ہم ہر حالت میں منزل تک پہنچانا چاہتے تھے۔

پولس کے جوان ہمارا پیچھا کرتے گلی کے موڑ تک آگئے تھے۔ گلی اندھیری نہیں ہوتی، اور اس پر دونوں طرف کی اونچی اونچی عمارتوں کی پرچھائی نہیں ہوتی، تو پولس والے یقیناً یہاں بھی آدھمکتے۔ اندھیری گلی میں قدم رکھنے کی ہمت انہیں شاید نہیں تھی۔

ہم لیکن پورے طور سے ڈرے ہوئے تھے۔ ایک مکان کے اوٹے پر ذرا دیر کو رک کر ہم تسلی کر لینا

چاہتے تھے کہ پولس والے اب بھی ہمارا پیچھا کرر ہے ہیں یا نہیں۔ گلی میں ان کے قدموں کی چاپ نہیں سنائی دے رہی تھی۔ تو بھی ہم پولس کے طور طریقوں سے اس قدر مانوس تھے کہ کوئی چوک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

تھوڑی دیر اوٹے کے نیچے اطمینان کی سانس لے کر واپس گلی میں آنا ہی چاہتے تھے کہ سامنے کے مکان کا باہری دروازہ کھلا۔ ایک جھکے بدن والی ضعیف عورت ہاتھ میں پانی کا خالی برتن لئے باہر آ گئی تھی۔ دروازے کے ٹھیک سامنے ہمیں دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹھکی، پھر کانپتی آواز میں پوچھا —
'کون ہو تم؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟'

'ماں جی، ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ باہر کے رہنے والے ہیں۔ ہماری ایک موسی ادھر ہی کہیں رہتی ہیں۔ انہیں کا گھر تلاش رہے ہیں۔ شام ہو گئی ہے۔ اس وقت کیسے پتہ ملے گا، یہی سوچ رہے ہیں۔'

'ایسا کرو، میرے پاس رک جاؤ۔ سویرے ان کا گھر ڈھونڈھ لینا۔ اندھیرے میں کہاں بھٹکو گے۔ پاس والے موڑ پر نل سے تھوڑا پانی لے کر آتی ہوں۔ چاہو تو میری کوٹھری میں بیٹھ سکتے ہو۔'

'ماں جی، ہمیں بتایئے پانی کہاں سے لانا ہے، ہم لے آئیں گے۔'

ہم نے ضعیف عورت کے ہاتھ سے پانی کا برتن لے لیا۔ لیکن نل کا جو راستہ اس نے بتایا وہ اسی موڑ کی طرف جاتا تھا، جہاں تھوڑی دیر پہلے پولس والے ہمارا پیچھا کرتے آ گئے تھے۔ کہیں وہ اب بھی ہماری تاک میں نہ ہوں، اور ہمارے گلی سے باہر آنے کا انتظار نہ کرتے ہوں۔ ایسے میں تو ہم آسانی سے دبوچ لئے جائیں گے۔ یہ اندیشہ ہمیں ستانے لگا۔

برتن ہمارے ہاتھوں میں دے کر عورت واپس کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ دروازہ اس نے ضرور

ہمارے لئے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

تھوڑی دیر ہم گلی میں کھڑے سوچتے رہے۔ ہم نے طے کیا کہ موڑ پر نل سے پانی لینے نہیں جائیں گے۔ پانی پھر آئے گا کہاں سے۔ ہم نے سوچا، دو تین مکان آگے کسی دروازے پر دستک دے کر پانی لے لیا جائے۔

پانی لے کر ہم کوٹھری میں آ گئے۔ عورت ایک تسلے میں چاول دھو رہی تھی۔ بغل میں کراسن اسٹوو رکھا تھا۔ ہم نے کمرے میں نظر ڈالی۔ معمولی، میڈیم سائز کا کمرہ، دونوں طرف بڑی بڑی کھڑکیاں۔ ایک کھڑکی اندر آنگن کی طرف کھلتی، جہاں اس وقت اندھیرا چھایا تھا۔ کمرے کی دیوار سے لگی ایک چٹائی بچھی تھی۔ ایک اور چٹائی دروازے کے پاس رکھی تھی۔

'چٹائی بچھا لو، میں کھانا بناتی ہوں۔ کھا کر سونا' عورت نے کہا۔

'ہم آپ کی کیا مدد کریں، ماں جی۔' ہم نے رسم نبھائی۔

'تم میرے بیٹوں کی طرح ہو۔ میں نے ان سے بھی کبھی کوئی مدد نہیں لی۔ تم سے کیسے لوں! پھر ایک دن کے لئے تم میری کیا مدد کرو گے؟ مجھے تو اکیلے ہی اپنی بچی ہوئی زندگی کاٹنی ہے۔'

عورت کی آواز کانپنے لگی تھی۔

ہم دونوں عورت کے قریب سمٹ آئے تھے۔ اسٹوو ہم نے ہی جلایا اور تھالیاں بھی صاف کیں۔

نمکین گیلے بھات کے نوالے اس رات ہمارے حلق میں انوکھا ذائقہ پیدا کر رہے تھے۔

عورت نے ہمارے لئے تھالیاں پروسیں، خود تسلے میں ہی کھایا۔

'ایک بار بڑا بیٹا آیا تھا، دو تھالیاں، دو گلاس رکھ گیا تھا۔ میں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ میرے لئے

تو یہ تسلہ ہی کافی ہے۔ اور کتنے دن بھگوان امتحان لے گا، میرے دن کب پورے ہوں گے، یہی سوچتی ہوں۔'

کھانے کے بعد کافی دیر تک وہ اپنی زندگی کی کتاب الٹتی رہی۔ اپنا گھر کلکتہ میں بتایا۔ خوشحال کنبہ۔ سڑک حادثے میں شوہر کو گزرے دس برس ہو گئے۔ پنشن کی رقم اس کی ضرورتیں پوری کرنے کو کافی۔ بیٹے روزگار سے لگے۔ پہلے تین برس تو بیٹوں کے ساتھ رہی۔ بہوئیں آ گئیں، تو آہستہ آہستہ گھر کا ماحول بدلنے لگا۔ پھر ایک دن اس نے اچانک کاشی میں بس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا تھا، بیٹے ماں کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے، اور کسی قیمت پر اسے کاشی میں اکیلے رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن ایسا دراصل ہوا نہیں۔ بیٹے ہنسی خوشی اسے کاشی جانے والی ٹرین پر بٹھا آئے۔ بہوئیں بچوں کے ہوم ورک کے نام پر گھر میں ہی رہ گئیں۔

سب کو معلوم تھا، ماں کاشی صرف اس لئے جا رہی ہے کہ وہاں زندگی کی کمیوں کا احساس اپنے آپ دور ہو جائے، اور جو کوئی انجان میں بھولیں ہوئی ہوں، ان کی تلافی بھی ہو جائے۔ کاشی، جنت کی سیڑھی جو ٹھہری!

یہاں آئے سات برس ہو گئے تھے اسے۔ ہر مہینے، باری باری سے، دونوں بیٹے اسے خرچا پانی کے لئے منی آرڈر بھیج دیتے۔ نہ زیادہ نہ کم۔ بس اتنا کہ اس کی دو شام کی خوراک نکل آئے۔ کپڑے، کچھ نقد پیسے بھی، کھانسی زکام کی دوا کے لئے۔

بیٹے شاید سوچتے ہوں، زیادہ آرام دینے سے ماں کی عمر کہیں زیادہ لمبی نہ ہو جائے!

پہلے ایک دو سال بیٹے بھولے بھٹکے آ جایا کرتے۔ پھر ان کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں۔ گھر دفتر کی

مصروفیت۔ چھٹیوں میں بہوؤں کے اپنے پروگرام۔

ادھر وہ بھی اکیلے پن کی عادی ہوگئی تھی۔ بیٹے اور ان کے بچے اسے ضرور یاد آتے تھے۔ کبھی تو اس شدت سے کہ وہ سوتے میں بھی چونک کر اٹھ بیٹھتی، اور رات کے اندھیرے میں ہی راستہ ٹٹولتے گھاٹ پہنچ جاتی۔

سورج اگنے تک وہیں گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی لہروں کے شور سنتی رہتی۔

ادھر تین برسوں سے کوئی نہیں آیا۔ آخری بار چھوٹا بیٹا آیا، تو دو سادہ پوسٹ کارڈ چھوڑ گیا، جن پر دونوں بھائیوں کے پتے لکھے تھے۔ کہنے لگا، مرتے وقت انہیں کسی سے پوسٹ کروا دینا۔ ہم سمجھ جائیں گے، تم نہیں رہیں۔ پھر ہم پیسے بھیجنا بند کر دیں گے۔

'میں نے پوسٹ کارڈ سنبھال کر رکھ لیا ہے۔ آنکھ موندنے سے پہلے پاس پڑوس میں کسی کے ذمے لگا دوں گی۔ جو انہیں پوسٹ کر دے گا......'

'کہاں ہیں، یہ پوسٹ کارڈ، ہمیں دکھائیں گی۔'

عورت نے چٹائی کے سرہانے قرینے سے رکھی کسی موٹی کتاب کے صفحے الٹ کر دونوں پوسٹ کارڈ نکالے۔ کالی روشنائی میں ان پر بیٹوں کے پتے لکھے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہوگی۔ پولس کے ساتھ دن بھر کی بھاگ دوڑ میں جو تھکان پیدا ہوئی تھی، وہ اس وقت ہماری آنکھوں میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

صبح کے شاید چار بجے ہوں کہ ہم چونک کر اٹھ بیٹھے تھے۔ چٹائی پر سمٹی عورت کی سانسیں تیز تیز چل

رہی تھیں ۔ بار بار اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتی تھی ۔ پورا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔

ہم گھبرائے سے اس کے سرہانے بیٹھے تھے کہ اس نے سینے کے درد پر قابو کرتے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

'میرا وقت آ گیا ہے، شاید۔تم کون ہو، میں نہیں جانتی ۔اس وقت میرے پاس ہو، میرے بیٹوں کی طرح ۔تم ہی میری چتا کو آگ دینا،تم ہی......'

میں چونک گیا۔ مجھے اپنا اصلی نام، اپنی اصلی کوکھ یاد آ گئی۔

'ماں جی، میں نے جھوٹ کہا تھا، میں انجنی نہیں ہوں...... میں تو......'

'میں جانتی ہوں،تم کیا کہو گے۔ یہی نا کہ تم یہ کام کیسے کر سکتے ہو۔تم انجنی نہیں، دراصل کچھ اور ہو۔ کیا فرق پڑتا ہے، اگر تم انجنی نہیں، کچھ اور ہی ہو۔ ...... اس وقت تو تم میرے بیٹوں کی طرح ہو۔ تمہیں ایشور نے اسی لیے تو میرے پاس بھیجا ہے کہ مرتے وقت میرے پاس رہو...... تم کیسے 'نا' کہہ سکتے ہو، بیٹا...... یاد رکھنا، میرے مرنے پر میرے بیٹوں کو پوسٹ کارڈ ضرور بھیج دینا۔انہیں ناحق پریشانی ہوگی...... ان کے پیسے برباد ہوں گے۔ انہیں ذمے داری بھی تو نبھانی ہے، اپنے بچوں کی، اپنے کنبے کی......'

اس کی آواز گھرگھرانے لگی تھی، اور گلا رندھ گیا تھا۔

پانی کے تسلے سے کچھ بوندیں ہم نے اس کے بند ہورہے گلے میں ٹپکائیں۔

زبان اور ہونٹوں کو تر کیا۔

گال پر ڈھلک آئے نمکین قطروں کو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھا۔

یہ اس کی زندگی کے آخری کچھ لمحے تھے، جو میری گود میں بیت رہے تھے۔

بال منڈانے سے لے کر شرادھ کرم تک، سارا کچھ ہم نے پوری ایمانداری سے انجام دیا۔ شوالے کے پنڈت نے ہمارے لڑکھڑاتے قدموں کو راستہ دکھایا۔ سچ مچ، اس بیچ، ایک بار بھی ہمارا اپنا نام ہمیں یاد نہیں آیا۔ نہ ہی اپنی کوکھ یاد آئی۔ زندگی میں ہم نے ایسی ایمانداری کہیں اور درشائی ہو، یاد نہیں۔ نہیں ہی درشائی ہو شاید!

کاشی میں ماں جی کی موت نے اسے جنت کا راستہ دکھایا یا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اتنا ضرور مجھے معلوم ہے کہ اس رات، جب اس نے میری گود میں اپنی آنکھیں موندیں، تو مجھے محسوس ہوا جیسے جنت میری گود میں اتر آئی ہے، اور فرشتوں نے میرے بوسے لئے ہیں!

انکل مائک

کچھ بھی تو نہیں بدلا، ان پچاس برسوں میں!

ڈاک بنگلے کے کشادہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے میں نے سوچا۔ بس اتنا سا فرق آیا ہے کہ ڈاک بنگلہ کمپاؤنڈ سے نکلنے پر جو سڑک بائیں طرف کو جاتی ہے، اور جہاں ان دنوں گہرا سناٹا پسرا ہوتا تھا، وہاں اس وقت کچھ پکے پختہ مکان کھڑے ہوگئے ہیں۔ شہری طرز کے مکان، جن میں پورٹیکو ہوتے ہیں، اور بالکونیاں بھی۔ جن کی کھڑکیاں اور دروازے، لکڑی کی جگہ، گہرے رنگ کے شیشوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔

'کب بنے ہیں یہ مکان؟ میرا مطلب، کتنے برس پہلے؟'
میں نے ڈاک بنگلے کے بزرگ کیئر ٹیکر بنسی سے پوچھا۔

'یہی کوئی آٹھ دس برس پہلے۔'

بنسی نے چھوٹا سا جواب دیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

'لیکن اس سڑک کے دونوں طرف جو بستی تھی، آدی باسیوں کی ...... وہ کیا ہوئی ...... وہ لوگ کہاں چلے گئے؟'

'انہیں یہاں سے اجڑے تو مدت ہوگئی۔ گھر پریوار سمیت وہ لوگ کب کے یہاں سے چلے گئے۔'

'چلے گئے، یا انہیں بھگا دیا گیا؟' میں نے بنسی کو ٹوکا۔

'آپ صاحب جی، جو کہیں۔ غریب لوگ تھے، کتنے دن ٹک پاتے۔ راتوں رات انسپکٹر صاحب نے نوٹس لگوادی۔ بستی چھوڑنے کے لئے انہیں مشکل سے دو چار گھنٹے کی مہلت ملی۔ لوگ بتاتے ہیں، یہاں سے اجڑ کر بیچارے اڑیسہ گئے، وہاں بھی اجڑنے کی نوبت آئی۔ ادھر برسوں سے ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ پتہ نہیں، کہاں مر کھپ گئے۔'

بنسی کی باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ پچاس برس پہلے کھونٹی کی اس بستی میں رہنے والے اپنے بچپن کے ساتھی سالکھو کے بارے میں مجھے یہاں اب کسی سے کوئی جانکاری نہیں مل سکے گی۔ اور میرا یہ سفر ادھورا رہ جائے گا۔

'لیکن آپ اس بستی کے بارے میں یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟'
ڈاک بنگلے کے خانساماں مجید نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

'یوں ہی، اپنی یادیں تازہ کرنے کو۔ میں نے بچپن کے کچھ برس یہاں، اس بستی میں گزارے ہیں۔ بستی کے بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں۔ ان سے جھگڑا ہوں، مار پیٹ کی ہے۔ دوستی کی ہے۔ اب بھی میرے ذہن میں ان سب کے چہرے آباد ہیں۔ تم کہتے ہو، بنسی، کہ ان کا کوئی اتا پتہ نہیں۔ کہیں سے کوئی جانکاری نہیں مل سکتی، آس پاس کے گاؤں سے بھی نہیں۔'

'کیسے ملے گی صاحب جی، کوئی یہاں رہے تب تو۔'

بنسی کہتا ہے، وہ کوئی چالیس سال پہلے یہاں آیا تھا۔ اپنی پہچان دیتے وقت بنسی یہ بتانا نہیں بھولتا کہ وہ میواڑ کا باشندہ ہے، اور اپنے علاقے کے ایک بڑے جنگل کے ٹھیکیدار کے ساتھ روزگار کے

چکر میں یہاں آ کر پھنس گیا ہے۔ یہیں اس نے شادی کی، اور بستی کے ایک کنارے ایک چھوٹا مکان بنالیا۔ اب وہ اپنے گھر میواڑ جانے کے بارے میں سوچتا تک نہیں۔

چائے کا دوسرا دور ختم ہو رہا تھا کہ مجید میرے بتائے پتے پر اسکول انسپکٹر تنگا کی کھوج خبر لے کر لوٹ آیا۔

'شیوراتری کی چھٹی ہے۔ دفتر کی بلڈنگ دیکھ سکتے ہیں۔ راستے میں ہی پڑے گی۔ انسپکٹر صاحب پریوار کے ساتھ کل ہی لوہردگا چلے گئے ہیں۔'

'ڈاک بنگلے سے سو قدم پر، بائیں طرف ایک پتلی گلی ہوا کرتی تھی، جس میں آمنے سامنے قطار بند چھوٹے بڑے کئی مکان ہوتے تھے۔ ان مکانوں میں سے ایک، چھوٹے سائبان والے مکان میں، ایک اسکول ٹیچر مائکل رہتے تھے۔ ہم انہیں 'انکل مائک' کہتے تھے۔ تم نے مائکل کا نام سنا ہے، مجید؟'

'آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، وہ پتلی گلی اب بھی ہے، اور اس کے دونوں طرف والے مکان بھی ہیں۔ چھوٹے اور بڑے قطار بند مکان۔ چھوٹے سائبان والا مکان بھی ہے۔ لیکن مائکل، وہی نا جو گٹار بہت اچھا بجاتے تھے، ہم نے انہیں دیکھا نہیں، ہم تو ان کے مرنے کے برسوں بعد یہاں آئے۔ مگر یہاں رہنے والوں سے ان کے بارے میں ہم نے کئی طرح کی کہانی سنی ہے۔'

'کہانی، کیسی کہانی سنی ہے تم نے، بتاؤ گے؟'

'یہی کہ وہ اسکول میں پڑھانے کے علاوہ آس پاس کے گھروں میں لڑکے لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے، انہیں گٹار بجانا سکھاتے تھے۔ اپنے پڑوسی، ڈاکٹر ناگ پال کے پریوار سے کافی گھلے ملے تھے۔ ان کی بیٹی کو بھی گٹار سکھاتے تھے۔ لیکن ایک دن اچانک بہت ہی پراسرار طریقے سے

ان کی موت ہوگئی......ایسی ہی اور باتیں......'

'مائکل کی موت ہوگئی! پھر تو تم نے مائکل کے بارے میں کافی کچھ جان رکھا ہے۔ کیسے ہوئی مائکل کی موت، اس بارے میں بھی تم نے کچھ سنا؟'

'نہیں، صاف صاف کوئی بات نہیں معلوم۔ سب ٹال جاتے ہیں، کوئی نہیں بتاتا، پرانے لوگ بھی نہیں۔ پھر یہ واقعہ بھی تو کافی پرانا ہوگیا۔ سب کہتے ہیں، اچانک مائکل کی موت ہوگئی، بس۔ ڈاکٹر کو بھی خبر نہیں دی جاسکی۔ کوئی دوا، کوئی علاج نہیں ہوسکا۔'

مجید جیسے گہری سوچ میں پڑ گیا ہو۔ اسے حیرت تھی، میں یہ سب آخر کیوں پوچھ رہا ہوں۔ میری مائکل میں دلچسپی کی وجہ کیا ہے۔ میں راکھ دان میں انگلیاں ڈال کر ماضی کو کریدنے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں۔

میرے سوالوں سے گھبرا کر مجید پوچھ بیٹھا —

'صاحب جی، آپ مائکل کو جانتے تھے؟ کیسے جانتے تھے؟ اس کی موت کے بارے میں آپ اور بھی کچھ جانتے ہیں؟'

بنسی اور مجید دونوں نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاک بنگلے میں ان کی بحالی میں کن لوگوں نے مدد کی تھی۔ اپنے پڑھے لکھے ہونے کی بات وہ بتا چکے تھے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ ان کے پاس افسروں کو دینے کے لئے رشوت کے پیسے نہیں تھے، اسی لیے مجبوراً انہیں ڈاک بنگلے کی چھوٹی موٹی نوکری قبول کرنی پڑی۔

میں نے مجید کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھا —

'ڈاکٹر ناگ پال کا پریوار اب کہاں ہے؟ اس مکان میں کون رہتا ہے؟'

'لوگ بتاتے ہیں، مائکل کی موت کے مہینے دن بعد ڈاکٹر ناگ پال اپنی جمی جمائی پریکٹس چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ اپنا مکان بھی انہوں نے کسی کو بیچ دیا۔ ناگ پال اس کے بعد کبھی اس بستی میں نہیں آئے۔ لیکن صاحب جی، آپ مائکل کو کیسے جانتے ہیں؟

'میں مائکل کو جانتا ہوں، مجید، اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہر روز اسکول سے لوٹنے پر مائکل میرے اور سالکھو کے ساتھ کیرم کھیلتے تھے۔ ہمیں پڑھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی تصویروں والی کتاب دیتے تھے۔ ہمیں قصے کہانیاں بھی سناتے تھے۔ ہم ان کے کمرے میں چٹائی پر بیٹھے پوری دلچسپی سے ان کی حیرت میں ڈالنے والی کہانیاں سنتے تھے۔ ہم ہی ان کے خط، کتابیں اور تصویریں ان کے پڑوسی ڈاکٹر ناگ پال کی بیٹی سارا کو پہنچاتے تھے۔ لیکن تم نے ٹھیک کہا، بنسی، ایک دن اچانک مائکل کی موت ہوگئی، وہ مر گئے۔'

اتنا کہہ کر میں رک گیا۔ مجید اور بنسی کو میں یہ نہیں کہہ پایا کہ جب مائکل نے آخری سانسیں لیں، میں سالکھو کے ساتھ ان کے کمرے میں موجود تھا، اور میری جیب میں مائکل کو دینے کے لئے سارا کا ایک خط تھا۔ میں انہیں یہ بھی نہیں بتا سکا کہ میں نے اور سالکھو نے اپنی آنکھوں سے مائکل کو خون کی الٹی کرتے اور زمین پر تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھا۔ وہ ایک عجیب ڈراؤنا منظر تھا۔ تھوڑی دیر تو ہمیں محسوس ہوتا رہا کہ انکل مائک اپنے ڈرامائی انداز میں ہمیں کوئی طلسمی قصہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن پھر، مائکل کے جسم کی حرکت بند ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں میں ایک ڈراؤنی اینٹھن پیدا ہوگئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ہم دونوں، میں اور سالکھو، چیختے چلاتے مائکل کے کمرے سے نکلے تھے۔

سامنے، گلی کی دوسری طرف، ڈاکٹر ناگ پال کے مکان کا باہری دروازہ کھلا تھا۔ ہم ہانپتے کانپتے

ان کے مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ ناگ پال آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی سیاہ کتاب تھی، لیکن آنکھیں دروازے پر ٹکی تھیں۔ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں ہمارے نہیں، کسی اور کے آنے کا انتظار ہو۔

'ڈاکٹر انکل، دیکھئے نا، انکل مائک کو کیا ہو گیا ہے۔ خون تھوک رہے ہیں ...... اور زمین پر تڑپ رہے ہیں۔ انکل آپ فوراً چل کر انہیں دیکھئے۔ ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے...... انکل ...... پلیز ...... انہیں بچائیے۔'

ڈاکٹر انکل نے کتاب تپائی پر رکھ دی۔ مڑ کر آنٹی کو دیکھا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر کچھ اجنبی سی سخت آواز میں بولے —

'تم دونوں اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ کسی سے نہیں کہنا تم نے مائکل کے گھر میں کیا دیکھا، کسی سے بھی نہیں۔ بس اپنے گھر جاؤ۔'

میں ڈاکٹر ناگ پال کی بیٹی سارا کو اس کا خط لوٹانے کے لئے ڈرائنگ روم کے بعد والے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر انکل نے مجھے سختی سے روک دیا۔

اپنے گھر کی پچاس قدموں کی دوری اس روز مجھے میل دو میل سے بھی زیادہ محسوس ہوئی۔ گھر کے باہر، دو برابر اونچائی والے درختوں کے سامنے کھلی جگہ پہنچتے ہی مجھے مائکل کے نام لکھا سارا کا خط دوبارہ یاد ہو آیا۔ مائکل کے نام سارا کا آخری خط!

میں نے جیب سے کاغذ نکالا۔ کاغذ کھلا تھا، مجھے کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہرے رنگ کی روشنائی سے سارا نے مائکل کو لکھا تھا —

'مائک! تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ اسکول سے لوٹنے پر ڈیڈی تمہیں کافی کے بہانے اپنے پاس

بلائیں گے۔ ہرگز مت آنا، ہرگز مت پینا ان کی کافی۔ گاڈ سیو یو...... مائیک...... تمہاری سارا......'

مجھے یاد ہے، میں نے اپنے مکان کے پیچھے والی جھاڑیاں میں اپنے ہاتھوں سے گیلی مٹی ہٹا کر کاغذ کا وہ ٹکڑا چھپا دیا تھا۔

یہ سب کچھ میں بنسی اور مجید کو نہیں بتا سکا۔ میں انہیں یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ اس واقعے کے دن سے ہی میں ہفتوں تیز بخار میں بستر پر پڑا تھا۔ بخار اتارنے کی ساری دوائیں ناکام رہیں۔ ڈاکٹروں نے شہر لے جا کر علاج کرانے کی صلاح دی۔

شاید مہینہ دن بعد، ٹھیک ہو کر بستی لوٹنے پر سالکھو نے مجھے بتایا، ناگ پال انکل نے اسی شام انکل مائیک کو گرجا گھر والے قبرستان میں دفنانے کا انتظام کر دیا تھا۔

دوسرے دن، گرجا گھر میں انکل مائیک کی آتما کی شانتی کے لئے جو اجتماعی دعا ہوئی، اس میں ڈاکٹر ناگ پال نے بھی حصہ لیا، اور موم بتیاں جلائیں!

دوسری دنیا

چائباسہ کے ایک پہاڑی ٹیلے پر تھا وہ چھوٹا سا مکان، جس کے ایک حصے میں ہمارا کنبہ رہتا تھا۔ کنبہ، یعنی میری اماں، میرے ابو، اور میری بہنیں۔ میرے بھائی باہر باہر رہتے تھے۔ کبھی کبھی ہی میری ان پر نظر پڑتی تھی، جب وہ پڑھائی کے دوران اپنی چھٹیاں گزارنے گھر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے، جب بھی وہ گھر آتے، میری اماں دل و جان سے ان کی خدمت میں لگ جاتی۔ جب تک وہ گھر پر رہتے، میری اماں تقریباً بھولی رہتی کہ میں بھی ان کی اولاد ہوں۔ گھر بھر میں سب سے چھوٹی اولاد۔

وہ دن میرے لئے بڑی خوشیوں کے دن ہوا کرتے۔ گھنٹوں گھنٹوں، ادھر ادھر بھاگتے رہنے پر بھی شاید ہی کسی کو میری یاد آتی۔ میں کہاں ہوں، کس کے ساتھ ہوں، کیا کر رہا ہوں، میں نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں، ان باتوں کو لے کر گھر کے کسی فرد کو کوئی خاص فکر نہیں ہوتی۔

ہاں، سوتے وقت، یہ ضرور دیکھ لیا جاتا کہ میں اپنے بستر پر موجود ہوں یا نہیں۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ دو کمروں کے مکان میں ہم بھائی بہنوں کے لئے جگہ بہت تھوڑی تھی۔

رات کے وقت، بستر پر کوئی کونا خالی رہنے پر سب کی نظر اس خالی کونے پر ضرور پڑ جاتی، اور تھوڑی دیر کے لئے گھر میں شور مچ جاتا۔

یہی ایک وقت ہوتا تھا، اکیلا وقت، کہ جب کنبے کا کوئی فرد چلا پڑتا —

'دیکھو، کہاں ہے، پڑوس میں ہوگا، جا کر لاؤ'

تب ہمارے کنبے کا کوئی مہربان آدمی اپنا بستر چھوڑ کر اٹھتا۔ بازو والے گھر کے دروازے پر دستک دی جاتی۔ گوپا کی ماں سے پوچھا جاتا، کیا میں ان کے گھر ہوں۔

جواب دینے سے پہلے گوپا کی ماں کئی کئی بار سوچتیں۔ ان کے گھر رک جانے کی وجہ سے کہیں آج پھر میری پٹائی تو نہیں ہوگی۔ جب تک اطمینان نہیں ہو، وہ مجھے نیند سے نہیں جگاتیں۔ اطمینان ہونے پر مجھے اپنے ساتھ لے کر میرے گھر آتیں۔

گھر بھر کی فکر ایک پل میں دور ہو جاتی۔

میں اس چھوٹے سے تجربے کے بعد اکثر دیر تک اپنے بستر پر لیٹا لیٹا سوچتا رہتا، میرے گھر والے آخر مجھے گوپا کے گھر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ کیوں مجھے گہری نیند سے جگا کر ہر رات اس طرح اپنے پاس لے آتے ہیں۔

لیکن میری آنکھوں میں آنے والی صبح کے سپنے اتنے خوبصورت ہوتے کہ میں اس چھوٹے تجربے کو بھول کر دوبارہ گہری نیند میں کھو جاتا۔

مجھے یاد ہے، ایک بار ہماری دادی اماں، ہم سب سے ملنے ہمارے گھر آ گئی تھیں۔ گوری چٹی، اونچے قد اور رعب دار آواز والی ہماری دادی اماں اپنے ساتھ نصیحتوں اور کہانیوں کا انمول خزانہ لے کر آئی تھیں۔

نماز پڑھنے کے بعد جو بھی وقت بچتا، وہ ہماری بہنوں کو لے کر بیٹھ جاتیں، انہیں اپنے تجربے کی

باتیں بتاتیں اور کہانیاں سناتیں ۔ ہماری اماں انہیں ایسا کرتے دیکھ کر خوش ہوتیں ۔

اکثر وہ تاریخ کے صفحات سے کسی طاقتور بادشاہ کے قصے اٹھا لیتیں ۔ پھر اس کی وفادار ملکہ کا حال سناتیں ۔ کہتیں کہ بادشاہ کے جنگی مہم پر جانے کے بعد اس کی ملکہ جو سجدے میں گرتی تو بادشاہ کی فتح کی خبر آنے کے بعد ہی اٹھتی ۔

دادی اماں کی کہانیاں شروع ہوتیں تو پھر ختم نہیں ہوتیں ۔ وہ اپنی کہانیوں میں نئے نئے باب جوڑتی جاتیں ۔ کہانی چلتی رہتی ، کئی کئی دن ، کئی کئی رات ۔

مجھے یاد ہے ، ایک دن دادی اماں نے کہانی کو ایک نیا موڑ دے کر سب کو چونکا دیا تھا ۔

بادشاہ اپنی زندگی کے ایک مشکل مقابلے سے لوٹا تھا ۔ فتح کا علم اس کے ہاتھوں میں تھا ۔ ملکہ ہمیشہ کی طرح سجدے میں تھی ۔ بادشاہ کی فتح کی خبر اس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی ۔ لیکن اس بار اس کا سجدہ بادشاہ کے محل میں داخل ہونے پر بھی جاری رہا ۔

'ایسا کیوں ، دادی اماں ؟'

مجھے یاد ہے ، میری بہنوں میں سے کسی نے دادی اماں کو ٹوک دیا تھا ۔

'بتاتی ہوں ، بتاتی ہوں ۔ یہی تو کہانی کا سب سے اہم حصہ ہے ۔ بادشاہ فتح کا علم لئے محل میں داخل ہوا ۔ محل میں داخل ہوتے وقت بادشاہ اکیلا نہیں تھا ۔

سیاہ نقاب میں کوئی اور بھی بادشاہ کے ساتھ ساتھ محل کے اندرونی حصے میں داخل ہوا ۔'

'اور کون ؟'

دادی اماں کو پھر کسی نے ٹوکا ۔

دادی اماں نے سوال جیسے سنا ہی نہیں۔

'بادشاہ نے کنیزوں سے ملکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ کنیزوں نے کہا، ملکہ عبادت خانے میں ہیں۔ آپ کے جنگ کی مہم پر جانے کے دن سے ہی وہیں ہیں۔

بادشاہ دبے پاؤں عبادت خانے کی دہلیز تک پہنچا۔

دور سے ہی ملکہ اسے سجدے میں نظر آئی۔

بادشاہ نے نقاب پوش کو عبادت خانے میں داخل ہو کر ملکہ کو سجدے سے اٹھانے کا اشارہ کیا۔

نقاب پوش نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹائی۔ ایک خوبصورت، بے حد خوبصورت، شاہی چہرہ سامنے ابھرا۔ بادشاہ اسے دشمنوں سے جیت کر لایا تھا۔

بادشاہ نے اپنا اشارہ دہرایا۔ سیاہ نقاب والی شاہزادی نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے ملکہ کو سجدے سے اٹھانا چاہا۔ لیکن، یہ کیا! ملکہ سجدے سے اٹھنے کی بجائے جائے نماز پر لڑھک گئی۔

ملکہ کی آنکھیں بند تھیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند تھیں۔'

کہانی کا آخری حصہ یہاں تک سنا کر دادی اماں ہمارے چہرے پر پیدا ہو رہے غم کا اثر پڑھنے لگیں۔

کمرے میں دادی اماں کے آس پاس خاموشی کا ماحول چھا گیا تھا۔

مجھے یاد ہے، میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے دادی اماں کو اپنے سوال سے تھوڑی دیر کے لئے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

'دادی اماں، آپ ہمیشہ بادشاہ اور ملکہ کی کہانیاں ہی کیوں سناتی ہیں، عام لوگوں کی کہانیاں کیوں نہیں سناتیں؟ ہمیشہ وفادار بیگموں اور بے وفا شوہروں کے قصے کیوں سناتی ہیں؟ مجھے یہ کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔ ان میں سچائی نہیں ہوتی۔'

'کیسی کہانی سننا چاہتے ہو تم، بیٹا؟'

مجھے یاد ہے، دادی اماں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

'عام لوگوں کی کہانی، دادی اماں، عام لوگوں کی کہانی۔ میری اور گوپا کی کہانی، سکلو اور ہنسی کی کہانی۔ میں اکثر اس پہاڑی ٹیلے کے نیچے والی بستی میں جاتا ہوں۔ وہاں مجھے کوئی راجا یا رانی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ننگے اور بھوکے لوگ ملتے ہیں، بیمار بچے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف بدحالی نظر آتی ہے، موت کا کھیل نظر آتا ہے۔ دادی اماں، آپ ہمیں ان لوگوں کی کہانی کیوں نہیں سناتیں، صرف راجا رانی کی کہانی کیوں سناتی ہیں؟'

مجھے یاد ہے، دادی اماں ایک لمحے کے لئے گھبرا گئی تھیں۔

ان کی بڑی بڑی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

'میں نے یہ دنیا نہیں دیکھی، بیٹا۔ میں کبھی اپنے گھر آنگن سے باہر نہیں نکلی۔ میں نے وہ بستیاں نہیں دیکھیں، وہ لوگ نہیں دیکھے، جنہیں تم اپنے اردگرد دیکھتے ہو۔ اس لئے میں ان کی کہانی نہیں کہہ سکتی۔ میں نے کتابوں میں بھی ان کی کہانیاں نہیں پڑھیں۔ میں انہیں نہیں جانتی، بیٹا، سچ کہتی ہوں، نہیں جانتی۔ میں ان سے کبھی نہیں ملی۔ میں نے کتابوں میں پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں پڑھی ہیں، بادشاہوں کے کارنامے پڑھے ہیں، ان کی بیگموں کی خوبصورتی اور وفاداری کے قصے پڑھے ہیں۔ اسی لئے ان کی کہانیاں سناتی ہوں۔'

مجھے یاد ہے، دادی اماں اس دن دیر تک بولتی رہی تھیں۔

ہم سب، بھائی بہن، سکتے میں تھے!

'تم میری دنیا سے الگ، ایک دوسری دنیا کے بچے ہو۔ تم نے یہ دوسری دنیا دیکھی ہے، اس لئے تمہیں میری کہانیاں پسند نہیں آتیں۔ میں تمہیں اس دوسری دنیا کی کہانی نہیں سنا سکتی۔ لیکن یہ کام تم کر سکتے ہو۔ یہ کام خود تم کو کرنا چاہئے۔ میں تمہیں صرف کہانی کہنے کا سلیقہ دے سکتی ہوں، اسلوب دے سکتی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھی اس دوسری دنیا کا حال تم ہی بیان کر سکتے ہو۔ تمہیں یہ کام کرنا چاہئے۔ کرو گے نا، یہ کام، بولو'

'کروں گا، ضرور کروں گا، دادی اماں۔ یہ کام میں ضرور کروں گا'

مجھے یاد ہے، بولتے بولتے میری آنکھیں چھلک آئی تھیں۔

وہ دن دادی اماں کے کہانی کہنے کا آخری دن تھا۔
اس دن کے بعد، جتنے دن بھی وہ ہمارے گھر رہیں، دادی اماں نے مجھے یا میری بہنوں کو کوئی کہانی نہیں سنائی۔

پھر، ایک دن، دادی اماں چائباسہ سے واپس اپنے گاؤں چلی گئیں۔

لوٹ کر وہ دوبارہ ہمارے گھر نہیں آئیں۔
جاتے جاتے، مگر، وہ ضرور میرے سینے پر ایک بھاری بوجھ ڈال گئیں!

وہ ایک رات

کوئی خاص بات ضرور ہوگی آج کہ ڈھابہ پہنچنے پر مجھے، ہمیشہ کی طرح، ڈھابے کے مالک گلاب چند کی جانی پہچانی آواز نہیں سنائی پڑی۔

مجھے یاد ہے، نیشنل ہائی وے کے اس ڈھابے میں، پچھلے پندرہ بیس برسوں سے لگاتار آتا رہا ہوں۔ صوبے کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جوڑنے والی یہی تو ایک شاہراہ ہے، جسے کسی حد تک غنیمت کہا جائے۔ باقی تو اس علاقے کی ساری سڑکیں بدحال ہیں، جن کا ذکر کرنا اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنا ہے۔

اپنے علاقے، اپنے گاؤں تک پہنچنے کے لئے بھی میرے پاس اس سڑک کے علاوہ اور کیا راستہ ہے۔ آتے جاتے، دیر سویر، مجھے اپنی گاڑی اسی ڈھابے میں روکنی پڑتی ہے۔ ڈھابے کا مالک، گلاب چند، اس کے سارے کارندے، یہاں تک کہ ڈھابے کے باورچی بھی، مجھے اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ میری پسند ناپسند سے بھی ڈھابے کے عملے واقف ہیں۔

برسوں سے میں یہی دیکھتا آیا ہوں۔ ڈھابے کے لمبے آنگن میں میری گاڑی لگی نہیں کہ گلاب چند نے اپنے منہ لگے ملازم، ریاضو کو آواز دی — 'پروفیسر صاحب آ گئے ہیں، پانی چائے لاؤ۔ رام بلی کو کم مسالے مرچ والی دال تیار کرنے بولو۔ روٹیاں، ٹھیک سے، کھاتے وقت سینکنا۔ سلاد، کھیر، سب کچھ تازہ دینا۔'

ہر بار، میرے ڈھابہ پہنچنے پر، گلاب چند کچھ ایسی ہی ہدایتیں اپنے ملازموں کو دیا کرتے۔ میں خود بھی ان ہدایتوں کا گویا عادی ہو گیا ہوں۔

لیکن آج جب میں گلاب چند کے ڈھابے پر پہنچا، تو مجھے یہاں کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔ ہر بار کی طرح، مجھے گلاب چند کے 'پروفیسر صاحب' والے جملے سننے کو نہیں ملے۔ آنگن یا اوسارے پر گلاب چند کا خاص ملازم ریاضو بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ ڈھابے کی فضا سہمی سہمی لگی۔

میں نے گاڑی سے کمبل، چادر اور تکیہ نکالا۔ اوسارے کے اس کنارے پر، جہاں میں عام طور پر اکیلے یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا کرتا ہوں، کوئی اور مسافر کمبل تانے چارپائی پر سویا پڑا ہے۔ تھوڑی دور پر ہی ایک چارپائی خالی ہے۔ وہیں میں نے اپنا سامان ڈال دیا ہے، اور ہلکے گرم پانی سے ہاتھ منہ دھونے چلا آیا ہوں۔

سردی اور دنوں کے مقابلے آج کچھ زیادہ ہے۔ رات کوئی زیادہ گہرائی نہیں ہے، لیکن کہرے کے سبب سڑک پر گاڑیوں کا چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ میرے ڈرائیور نے تو جیسے اپنے ہاتھ ہی اٹھا دیئے ہیں۔

'ایکسیڈنٹ کا خطرہ ہے، اندھادھند چلنے والی ٹرکوں سے۔ آہستہ آہستہ گاڑی چلا کر کچھ اور دوری طے کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہاں کے بعد کافی دور تک کوئی ڈھنگ کا ڈھابہ نہیں ہے، جہاں آپ رات گزار سکیں۔ یہیں رکنا ٹھیک رہے گا۔'

میں نے اپنے ڈرائیور سراج کی صلاح مان لی ہے۔

ہاتھ منہ دھو کر لوٹا ہوں، تو گلاب چند جہاں بیٹھ کر آنے جانے والوں کا حساب کیا کرتے تھے، وہ چوکی خالی دکھائی دی ہے۔ ہاں، لکڑی کا ایک پرانا صندوق، جس میں گلاب چند اپنے پیسے رکھتے

تھے، پہلے کی طرح، چوکی کے ایک کنارے پڑا ہے۔ ہر روز کی طرح، آج بھی اس میں تالے نہیں لگے ہیں۔

'ریاضو کہاں ہے؟'

میں نے پانی کا گلاس لے کر آئے لڑکے سے پوچھا۔

'نہیں ہے......'

'اور تمہارے مالک، گلاب چند، وہ کہاں ہیں؟'

'وہ بھی نہیں ہیں، ضروری کام سے باہر گئے ہیں۔'

کوئی پندرہ بیس برسوں سے میرا اس علاقے میں آنا جانا ہو رہا ہے۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ ڈھابہ کھلا رہے اور گلاب چند اپنی چوکی پر بیٹھے پیسوں کا حساب کرتے نظر نہیں آئیں۔

میں نے چارپائی پر بیٹھے لیٹے چاروں طرف نظریں گھما کر ڈھابے کا جائزہ لیا ہے۔ ڈھابے کے باہر، آنگن کے سامنے والی سڑک پر، دور دور تک، جہاں ٹرکوں، گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں، وہاں مجھے اس وقت گہرا سناٹا پسرا دکھائی دیا۔ سڑک بالکل سونی ہے۔ کنارے کنارے، پان سگریٹ کی دکانیں بھی بند ہیں۔

میرا ڈرائیور، سراج، گاڑی کی ڈکی سے اپنا سامان نکال رہا ہے۔ اوسارے کی دوسری طرف اس نے بھی شاید اپنے لئے ایک چارپائی ڈھونڈ لی ہے۔

روٹی، تڑکا، دال، کھیرا آنے میں عام دنوں سے زیادہ دیر ہوتی دکھائی دی، تو میں نے رسوئی گھر کی طرف دیکھتے ہوئے رام بلی کو 'کوئی ہے،' جیسی آواز لگائی۔

’آیا صاحب‘ کا جواب دینے کے تھوڑی دیر بعد ڈھابے کا کوئی عملہ میری چارپائی پر تھالی کٹورہ رکھ گیا ہے۔

’ریاضو نہیں ہے کیا؟‘ میں نے گرم روٹی کا پہلا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا ہے۔

’کہاں نا صاحب، نہیں ہے۔‘

میں نے اس کے لہجے کی بے رخی اور جھلاہٹ محسوس کرتے ہوئے بات بدلنی چاہی —

’کھیر نہیں بنی ہے؟ دال میں آج مرچ کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔ اور ہاں، سلاد بھی نہیں دیا......‘

میری بات لگ بھگ کاٹتے ہوئے ڈھابے کے عملے نے جواب دیا —

’مالک نے آج ڈھابہ بند کرنے کا آرڈر دیا ہے۔ جو کچھ بچا کھچا تھا، میں نے لا دیا۔ مالک کا آرڈر ہے، آج رات ڈھابے میں کوئی نہیں ٹھہرے گا......‘

’کوئی نہیں؟ میں بھی نہیں؟ گلاب چند ہیں کہاں؟‘

’مالک نہیں ہیں، باہر گئے ہیں، آرڈر دے کر گئے ہیں......‘

مجھے محسوس ہوا، میرے گلے میں، روٹی کا پہلا ٹکڑا ہی جیسے اٹک گیا ہو۔

’لیکن اس کہرے والی رات، میں کہاں، کیسے جاؤں؟ مجھے رات تو یہیں گزارنی پڑے گی۔ اب، اس وقت یہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔‘

’کیا نام ہے، تمہارا؟ مجھے پہچانتے ہو نا؟‘

’پہچانتا ہوں، پروفیسر صاحب ہیں، آپ۔ مالک نے آپ کو بھی یہاں ٹھہرنے سے منع کیا ہے۔

اب آپ جلدی کریں، میں نے آپ کے ڈرائیور کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔'

سرد ہواؤں نے ایکبارگی جیسے میرے جسم کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو، جسم کی ہڈیوں کے جوڑ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر بکھر رہے ہوں۔ اور ان کے اندر بہنے والا کوئی سیال مادہ اچانک برف میں تبدیل ہو گیا ہو۔

'صاحب جی......' سامنے میرا ڈرائیور سراج کھڑا ہے۔

'اسی وقت یہاں سے نکل چلنا ہے، صاحب، یہ نہیں چاہتے کہ ہم یہاں ٹھہریں ...... آس پاس علاقے میں فساد کا ماحول ہے، کچھ واقعات بھی ہوئے ہیں......'

'لیکن ہمارے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے، ہم تو گلاب چند کو بیسوں برس سے جانتے ہیں۔ وہ بھی ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں......'

تبھی میرے پاس والی چارپائی پر سوئے آدمی نے کروٹ لی ہے۔

کمبل چادر سے اس کا جسم اب بھی ڈھکا ہے۔

'بحث سے کیا فائدہ، صاحب! نہیں چاہتے جب یہ لوگ کہ ہم یہاں ٹھہریں، تو بحث سے کیا فائدہ! یہاں سے فوراً نکل چلتے ہیں۔'

'لیکن تم تو کہتے تھے، کہرے میں ایکسیڈنٹ کا خطرہ ہے، تیز رفتار ٹرکوں سے۔ اس اندھے کہرے میں ...... ایکسیڈنٹ کا خطرہ مول لینا، ٹھیک ہے؟ ...... گلاب چند کہاں گئے، ان کے ڈھابے میں میرے ساتھ ایسا سلوک ......؟ اتنی رات، سرد ہوا، کہرا، سناٹا......! آخر ہم کیسے جائیں، بولو، کہاں جائیں...... اس وقت......'

میرے پاس والی چارپائی پر کمبل سے ڈھکے، سوئے پڑے آدمی نے دوسری کروٹ لی ہے۔ اس بار اس کی کروٹ مجھے پُراسرار محسوس ہو رہی ہے۔

'لیکن ...... میری مجبوری بھی سمجھئے۔ مالک کا آرڈر ہے۔ آپ کو یہاں نہیں رکنے دینا ہے۔ آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ جلدی یہاں سے چلے جائیں۔ مالک نے ایسا ہی کہا ہے۔'
ڈھابے کا عملہ اچھا برا سمجھانے کے انداز میں بول رہا ہے۔

'کہاں ہیں، تمہارے مالک، گلاب چند؟ میں نہیں جاؤں گا، اتنی رات گئے، ڈھابے سے، تو کیا کرو گے تم، بولو، کیا کرو گے؟'

پاس کی چارپائی پر سوئے آدمی نے تیسری بار کروٹ لی ہے۔
اس کی کروٹ سے چارپائی میں ہلکی چرمراہٹ پیدا ہوئی ہے۔

اچانک ایک تیز آواز کے ساتھ چارپائی پر سویا آدمی کمبل چادر پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

'میں یہاں ہوں۔ بار بار، پوچھ رہے ہو، میں کہاں ہوں، تو لو میں یہاں ہوں، دیکھو میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ فوراً ڈھابے سے چلے جاؤ، ورنہ تمہیں بھی وہیں پہنچا دیں گے، جہاں ریاضو کو پہنچایا ہے۔ وہ ملیچھ بھی، تمہاری طرح، بار بار، یہی کہتا تھا، ڈھابہ چھوڑ کر نہیں جائیں گے، کیا کرو گے؟'

پیٹرومیکس کی روشنی میں، میری کانپتی آنکھوں نے دیکھا۔

میرے سامنے، ڈھابے کا مالک، گلاب چند کھڑا ہے۔

گلاب چند کے ہاتھوں میں کوئی تیز ہتھیار چمک رہا ہے!

گدّی

چناؤ میں اب بھی سات دن بچے ہیں، لیکن چناؤ کی گہما گہمی یکا یک تھم گئی ہے۔ دن رات کان کے پردوں میں لرزش پیدا کرنے والا شور اچانک اس طرح خاموشی میں بدل جائے تو حیرانی کسے نہیں ہوگی۔

میری تو جیسے دلی مراد پوری ہوگئی ہو۔ شہر سے فرصت کے کچھ دن نکال کر اپنے گاؤں اس لئے آیا تھا کہ لمبے دنوں کے بعد رشتے داروں سے مل بھی لوں گا اور اپنی نئی کتاب کے آخری حصے کو مکمل بھی کر لوں گا۔ لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر مجھے اپنے فیصلے پر افسوس ہو رہا ہے۔ گاؤں بھر میں پنچایت چناؤ کا بخار چھایا ہوا ہے۔ جسے دیکھو وہی کسی نہ کسی امیدوار کا حمایتی بن گیا ہے۔ امیدواروں اور حمایتیوں کے بیچ بٹ گیا ہے پورا گاؤں۔ رشتے ناطے بے معنی ہو گئے ہیں۔

پنچایت کے چناؤ دراصل دو دہائی کے بعد ہو رہے ہیں۔ پچھلے مکھیا کے مرنے پر ان کے بیٹے نے باپ کی جگہ سنبھال لی تھی۔ یوں تو نائب مکھیا کی حیثیت سے وہ کئی کئی برس سے پنچایت کے کام دیکھتے آ رہے ہیں۔ اس لئے باپ کی جگہ لینے میں بیٹے کو پریشانی نہیں ہوئی۔

پنچایت کے سبھی لوگ منگل سنگھ کے گھرانے کی روایت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے دادا بھی تیس برس تک اس پنچایت کے مکھیا رہ چکے ہیں۔ آزادی سے پہلے، انگریزوں کے خاص طرفداروں میں ان کی گنتی ہوتی تھی۔ اچھا خاصا دبدبہ تھا ان کا، پورے ضلع میں۔

ہمارے دادا جی جب تک زندہ رہے، اور جب تک ان کی دمّے کی بیماری نے انہیں اس کی اجازت دی، وہ گاؤں گھر کو منگل سنگھ کے دادا کی زیادتیوں کی کہانیاں سناتے رہے۔ دونوں ہم عمر تھے اور تھوڑے دن شاید ایک ساتھ گاؤں کی پاٹھ شالہ میں پڑھے بھی تھے۔

دادا جی کی یادداشت پورے علاقے میں مشہور تھی۔ ایک بار جسے دیکھ لیا، اس کا چہرہ ان کے دماغ میں پتھر کی لکیر کی طرح محفوظ ہو جاتا۔ پوری پوری بات چیت، الفاظ، محاورے، یہاں تک کہ لہجہ بھی انہیں اچھی طرح یاد ہو جاتا۔ انگریزی اچھی خاصی جانتے تھے۔ انگریزوں کی باتیں دہراتے وقت کسی کے لئے بھی اصل اور نقل کا فرق کرنا مشکل تھا۔

اکثر، چھٹیوں کے دن، جب ہم اپنے بھائیوں کے ساتھ گاؤں آتے تو دادا جی ہمیں منگل سنگھ کے خاندان کی انگریز پرستی کے قصے ضرور سناتے۔ وہ یہ کہنا نہیں بھولتے کہ کیسے ایک بار منگل سنگھ کے دادا کے کارندوں کی مخبری کے سبب وہ سن بیالیس کی لڑائی میں پولس کے ہاتھوں دبوچ لئے گئے تھے، اور کیسے ایک انگریز افسر کے اشارے پر، رائفل کے کندے سے سنگین طور پر زخمی ہو گئے تھے۔ ان موقعوں پر، دادا جی اپنی بنیان اتار کر ہمیں اپنے زخموں کے نشان دکھانا نہیں بھولتے تھے۔

دادا جی سے ہم بھائیوں کو ہمیشہ شکایت رہتی۔ ہمارے لاکھ پوچھنے پر بھی وہ اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ ان کی گرفتاری اور پٹائی کے پیچھے خود منگل سنگھ کے دادا کا کوئی ہاتھ تھا یا نہیں۔ ہمیشہ وہ ہمارے اس سوال کو ٹال جاتے۔ ضد کرنے پر مشکل سے اتنا ہی کہہ پاتے: اس واقعہ کی یاد آتے ہی میرے زخم تازہ ہو جاتے ہیں اور انگریزوں کا بربریت آمیز سلوک دہشت بن کر میری آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے۔ میں اس واقعہ کو دوبارہ یاد نہیں کرنا چاہتا۔

لیکن سچائی یہ ہے کہ دادا جی اس واقعہ کو ایک دم سے بھولنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ دادا جی کے الفاظ

ان کا کرب بن کر ابھرتے تھے۔ اس لئے ہم انہیں زیادہ چھیڑتے نہیں تھے۔

مگر دو دہائی قبل، جب پنچایت کے چناؤ کا اعلان ہوا اور منگل سنگھ کے والد مکھیا کے عہدے کے امیدوار ہوئے تو دادا جی کے صبر کی حد یکا یک ٹوٹ گئی۔ انہوں نے منگل سنگھ کے والد کی دعویداری کی کھلی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ گاؤں کے عمر دراز لوگوں سے صلاح مشورہ کرنے پر سب نے دادا جی کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔

'کیا فائدہ، اس جھمیلے میں پڑنے سے؟ آپ تو اتنے برسوں سے بابو صاحب کی ڈیوڑھی کا حال جانتے ہیں۔ ان کی دوستی اور دشمنی میں زیادہ فرق نہیں، نسل در نسل، ان کی دشمنی چلتی ہے۔ آپ کی اتنی عمر ہوگئی۔ بیٹے پوتے کے لئے ڈیوڑھی سے دشمنی کیوں مول لینا چاہتے ہیں؟ کیا حاصل ہوگا اس جھگڑے سے؟'

گاندھی جی کی اپیل پر برسوں جیل میں رہے گھنشیام کاکا نے دادا جی کو اپنا فیصلہ بدلنے کی صلاح دی۔ ڈاک گھر کی نوکری سے ریٹائرمنٹ لے کر حال میں گاؤں لوٹے سلکن کاکا نے بھی گھنشیام کاکا کی ہاں میں ہاں ملائی۔

'تم تو کہتے تھے، سلکن یاد و، کہ تمہیں گاندھی جی کے فرمان پر جیل نہیں جانے کا ساری زندگی افسوس رہے گا۔ پھر کیا پنچایت میں بابو صاحب کی ڈیوڑھی کا ہی راج چلتے رہنا چاہئے؟ انگریزوں کی طرفداری کے زمانے سے لے کر اب تک گاؤں میں انہیں کا تو راج چل رہا ہے۔ خود تیس برس پنچایت کے مکھیا رہے، اب مرتے وقت بیٹے کو گدی سونپنا چاہتے ہیں۔ پوتا بھی لائن میں آ گیا ہے۔ بیٹے کے بعد اس کی باری ہے۔ یہی چلتا رہے گھنشیام؟ بولو۔ کس بات کی ہے پنچایت، سلکن، کہو کس بات کی؟'

دادا جی نے اپنے آنگن میں فرش پر بیٹھے بیٹھے جب یہ بات کہی تو گاؤں کے سبھی عمر دراز لوگ سنائے میں آ گئے۔ سب کے سینے کے زخم جیسے یکا یک تازہ ہو گئے۔ سب کے بدن سے ٹیسیں ابھرنے لگیں۔ کسی میں دادا جی کا فیصلہ کاٹنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

لمبی بحث کے بعد، دادا جی کے آنگن میں طے ہوا کہ اپنا امیدوار دے کر بابو صاحب کی دعویداری کو چیلنج کیا جائے۔

'لیکن ہمارا امیدوار ہوگا کون؟' رگھبن کاکا نے ٹوکا۔

آنگن میں بیٹھے لوگوں کے دماغ میں اچانک کوئی نام نہیں سوجھا، جسے بابو صاحب کے مقابلے کھڑا کیا جائے۔ سب نے ایک رائے سے امیدوار طے کرنے کا ذمہ دادا جی کو سونپنا چاہا۔ پہلے تو وہ تیار نہیں ہوئے لیکن نشست میں بیٹھے لوگوں کے دباؤ کے آگے انہیں یہ تجویز ماننی پڑی۔

دوسرے دن گاؤں کی سبھا بیٹھی، دادا جی نے اپنا فیصلہ سنایا: ہماری طرف سے امیدوار ہوگی رگھبن سہنی کی بیٹی شانتی۔

دادا جی کے آنگن میں بیٹھے لوگوں نے تشویش بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

شہر میں اونچی پڑھائی کر کے رگھبن کاکا کی بیٹی شانتی اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ تھوڑے دنوں کی چھٹی گزارنے گاؤں آئی تھی۔

'لیکن اسے چناؤ لڑنے کے لئے راضی کون کرے گا؟' کونے میں بیٹھے نسیم چاچا بولے۔

'ہم سب مل کر اسے راضی کریں گے۔ گاؤں کی عزت کی بات ہے۔ بیٹی گاؤں کی عزت رکھنے میں ہمارا ساتھ نہیں دے گی تو دوسرا کون دے گا' دادا جی نے بحث کا خاتمہ کرنے کی صورت میں کہا۔

شام کو سبھا پھر بیٹھی۔ سبھا میں رتجھن سہنی کی بیٹی اور داماد بھی شامل ہوئے۔ تھوڑے حیلے حوالے کے بعد تجویز پر رضامندی ہوگئی۔ فیصلہ ہوا کہ دوسری صبح شانتی اپنی امیدواری داخل کرے گی اور پورا گاؤں اس کی حمایت میں کھڑا ہوگا۔

دادا جی کے آنگن کا یہ فیصلہ پوشیدہ نہیں رہا۔ آگ کی طرح، منٹوں میں ہی بابو صاحب کی ڈیوڑھی میں اس کی کاٹ کے لئے جو تدبیر تیار ہوئی، اس کا راز اس کے عمل میں آنے کے بعد ہی کھلا۔

پو پھٹنے سے پہلے ہی ضلع کی پولس کسی دہشت گرد نکسلی تنظیم سے جڑا ہونے کے شک پر شانتی اور اس کے شوہر کو گرفتار کر کے شہر لے گئی۔

گاؤں کی حد سے پولس کے چلے جانے کے بعد ہی دادا جی اور پورے گاؤں کو اس گرفتاری کی خبر ملی۔

اِدھر پورا گاؤں صدمے میں، اُدھر بابو صاحب کی ڈیوڑھی سے باجے گاجے کے ساتھ منگل سنگھ کے والد اپنی امیدواری داخل کرآئے۔ ان کے مقابلے کوئی دوسرا پرچہ داخل نہیں ہوا۔ منگل سنگھ کے والد نے باپ کی پگڑی سنبھال لی۔ آگے چل کر اپنے بیٹے منگل سنگھ کو نائب مکھیا کے عہدے پر بٹھا دیا۔ دونوں لمبے دنوں تک ان عہدوں پر قابض رہے۔

تقریباً دو دہائی تک اس واقعہ کے دوران ہمارے دادا جی، گھنشیام کاکا، سلکن کاکا، رتجھن کاکا، سب کے سب اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ہمارے والد صاحب جب تک سرکاری نوکری میں رہے، گاؤں سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔ شادی بیاہ، مرنے جینے پر ہی وہ گاؤں کا رخ کرتے۔

پیچھے گاؤں کی پنچایت پر بابو صاحب کا شکنجہ بدستور بنا رہا۔ ڈیوڑھی کے پولسیا رشتے اور گہرے ہوتے گئے۔ علاقے کے منتخب نمائندے بھی ان کے من مطابق ہی چلتے رہے۔

لیکن، دو دہائی بعد، جب پنچایت چناؤ کی ڈگڈگی بجی ہے تو گاؤں کی فضا جیسے اچانک بدل گئی ہے۔ سبھی بزرگ ایک ایک کر کے چل بسے ہیں۔ کوئی نہیں رہ گیا ہے، جو گاؤں کی نئی نسل کو بابو صاحب کی ڈیوڑھی کی بے عزتیوں کا حساب چکانے کی نصیحت کرے۔ گاؤں گھر کو باندھ کر رکھنے کی قوت بھی کسی میں نہیں ہے۔

منگل سنگھ کو دو دہائی قبل پنچایت چناؤ کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ شانتی اور اس کے شوہر کی گرفتاری اور منگل سنگھ کے والد کا بلا مقابلہ مکھیا چنا جانا، سب کچھ انہیں کل کی بات کی طرح یاد ہے۔ پھر بھی چناؤ میں اپنی جیت کے لئے وہ پوری طرح مطمئن ہیں۔ انہیں ووٹ کے علاوہ سرکاری عملوں سے اپنے گہرے رشتوں پر بھی بھروسہ ہے۔

لیکن بیس برس پہلے اور آج کے چناؤ میں ایک بڑا فرق انہیں کبھی کبھی پریشان کر دیتا ہے۔ کبھی منگل سنگھ کے دادا نے پولس سے مل کر شانتی اور اس کے شوہر کو جھوٹے الزام میں گرفتار کرا دیا تھا اور پنچایت میں کوئی ان کے مقابلے اپنا دعویٰ پیش تک نہیں کر پایا تھا۔ لیکن اس بار ان کے خلاف آدھا درجن امیدوار میدان میں ہیں۔

اس کے باوجود، انہیں یقین ہے کہ وہ اپنی کارستانی کے زور پر چناؤ ضرور جیت جائیں گے۔

چناؤ کے سات دن پہلے شور اور ہنگامے کا یکا یک اس طرح تھم جانا گاؤں میں کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ وہ حیرت میں ہیں۔ میری بیوی، جو خود دادا جی کے قصوں کی گواہ رہی ہے، مجھ سے پوچھتی ہے، 'گاؤں والوں کو یکا یک کیا ہو گیا کہ اس طرح خاموش ہو گئے؟ کیا ڈیوڑھی والوں نے چناؤ پر چار پر روک لگا دی؟'

جب کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، تو میں خود گاؤں کا جائزہ لینے گھر سے باہر نکلا۔

باہر، مجھے پولس کی کچھ جیپیں اپنے گھر کی طرف آتی دکھائی دیں۔ ان میں سے ایک جیپ ٹھیک میرے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ ایک جوان پولس افسر جیپ سے اترا۔

'آپ شالیگرام دادا کے......'

'جی، میں ان کا پوتا راجیو ہوں۔ لیکن آپ......'

'میں انوپ ہوں، ضلعے کا نیا ایس پی، کل ہی جوائن کیا ہے۔ کل ہی دیر رات چھاپے ماری کے لئے یہاں آنا پڑا۔ ہتھیاروں کا بڑا ذخیرہ برآمد ہوا ہے۔ کسی سنگین کانڈ کی تیاری تھی۔ کئی شاطر ملزم رنگے ہاتھ پکڑے گئے۔ ان کے سرغنہ بھی گرفتار ہوئے۔ سب کو شہر بھیج کر، سوچا آپ سے مل لوں۔'

'آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟'

'میں رنجھن سہنی جی کی بیٹی شانتی دیوی کا بیٹا ہوں۔ میری ماں اکثر آپ کے دادا جی اور آپ کا ذکر کرتی ہیں۔ یہاں آنے لگا تو ماں نے تاکید کی تھی کہ آپ سے ضرور ملوں۔'

میں نے شانتی کے بیٹے کو چائے پی کر جانے کو کہا، لیکن اسے شہر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس نے اپنے ڈی ایس پی کو منگل سنگھ کی ڈیوڑھی پر تالا جڑ دینے کا حکم دیا اور مجھ سے دوبارہ گاؤں آ کر کچھ وقت گزارنے کا وعدہ کیا۔

پنچایت چناؤ اپنی تاریخ کو ختم ہوا۔ نتیجوں نے کسی کو چونکایا نہیں۔ گھنشیام کاکا کی بہو ساوتری پنچایت کی مکھیا بنی۔ بابو منگل سنگھ اپنے پرکھوں کی گدی بچانے میں ناکام رہے۔ ان کی ضمانت بھی نہیں بچ پائی۔

چھٹیاں گزار کر کام پر لوٹتے وقت میں نے وہی راستہ چنا، جہاں بابو صاحب کی ڈیوڑھی کے پھاٹک

پر پولس کے تالے دکھائی دے رہے ہیں۔

مجھے داداجی کی بنیان کے نیچے انگنت زخموں کے نشان یاد آ گئے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی ہیں!

بند آنکھوں سے

وہ تعداد میں صرف پانچ تھے۔ ان میں تین کے چہرے سیاہ نقاب سے ڈھکے تھے۔ چوتھے نے اپنا سر سفید رومال سے اس طرح چھپایا ہوا تھا کہ ناک نقشہ نظر آنے پر بھی چہرہ پہچان میں آنا مشکل تھا۔ پانچواں شخص بے نقاب تھا۔ حرکت و عمل سے وہ اس گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔

دیکھنے میں پانچوں صحت منداور خوش حال نظر آرہے تھے۔ بظاہران کے ہاتھ ہتھیاروں سے خالی تھے۔ لمبے، دھاری دار کرتے کے نیچے انہوں نے کچھ خطرناک اسلحے چھپا رکھے ہوں، تو اس کا اندازلگانا آسان نہیں تھا۔

سکریٹریٹ کیمپس سے پانچوں نکلے تو تھے الگ الگ راستوں سے، لیکن یہاں بڑے سائز والی مورتی کے چوراہے پر آکر پانچوں ایک ساتھ ہو گئے تھے۔ سب کے چہرے پر یقینا اطمینان کی لکیریں رہی ہوں گی کہ وہ وقت کے کس قدر پابند اور اپنے مشن کے تئیں کتنے وفادار ہیں۔ شام کے دھندلکے میں ان کے چہرے پر ابھرنے والی اطمینان کی لکیروں کو لے کر صرف قیاس لگایا جاسکتا تھا۔ لیکن ان کے چلنے رکنے، آپس میں دبی زبان سے بات چیت کرنے کے انداز سے ان کے چہرے پر ابھری اطمینان کی لکیروں کے تئیں مطمئن ضرور ہوا جاسکتا تھا۔

چوراہے سے کچھ آگے بڑھ کر انہوں نے سڑک کے ایک کنارے کھڑی سیاہ رنگ کی گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے کسی آدمی کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ گاڑی شاید پہلے سے ان کے انتظار میں وہاں

کھڑی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور آگے پیچھے پانچوں لوگ اس میں سوار ہو گئے۔

یہاں تک تو میری آنکھوں نے ان کا پیچھا کیا۔ پھر وہ کدھر گئے، اور کہاں، مجھے اس وقت معلوم نہیں ہو پایا۔

سٹی بس پکڑ کر جب میں اپنی کالونی پہنچا تو گھر والی سڑک پر مڑتے ہی اچانک کالے رنگ کی وہ گاڑی مجھے اپنے گھر کے لگ بھگ سامنے پارک کی ہوئی نظر آئی۔ مجھے گاڑی دیکھتے ہی عجیب اندیشے کا احساس ہونے لگا۔ کیا میں ہی ان کا ٹارگیٹ ہوں!

میرے لئے اپنے گھر والی سڑک پر اور آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اپنے قدم لوٹا لئے۔ اب میں تیز رفتار سے واپس فلائی اوور کی طرف بھاگ رہا تھا۔

بیچ فلائی اوور میں اچانک مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ گلا بالکل خشک ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں جیسے لڑکھڑانے لگیں۔ آگے پیچھے کوئی راہگیر بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے مدد کی فریاد کی جاتی۔ ایک بوند پانی کے لئے بھی کس کے آگے ہاتھ پھیلاتا۔ سر میں چکر آ رہا تھا۔ میں فلائی اوور کے بیچوں بیچ کھڑی ریلنگ کا ایک سرا تھام کر ڈیوائیڈر پر بیٹھ گیا۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا کہ میرے صاف کپڑوں پر دھول کی پرتیں جم سکتی ہیں۔ دراصل اس وقت مجھے دھول نہیں، کالے رنگ والی گاڑی میں بیٹھے ان پانچ سواروں کی فکر تھی، جو میرے گھر والی سڑک پر، میرے اندازے کے مطابق، میرا انتظار کر رہے تھے۔ اور جن کے ارادے نیک نہیں تھے۔

کون ہو سکتے ہیں آخر وہ پانچ لوگ جو اس گاڑی میں سفر کرتے میرے گھر والی سڑک تک آ گئے تھے۔ دفتر کے سنگی ساتھی؟ جو میری شہرت سے پریشان ہو کر اندر ہی اندر مجھ سے حسد کرنے لگے تھے۔ یا کچھ دوسرے لوگ، جنہیں میری کامیابیوں سے نفرت تھی۔ اور جو مجھے جان لیوا سبق سکھانا

چاہتے تھے۔ یا پھر کسی سیاسی گروہ کے کارندے، جو ذاتی بغض کے سبب میری دشمنی پر اتر آئے تھے۔ یہ پانچوں ان میں سے کون ہو سکتے ہیں!

ابھی تک تو شاید میرے ہوش وحواس ٹھیک تھے، کیوں کہ میں منطق کے سہارے اپنے دماغ کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہا تھا۔ لیکن خشک گلے اور سر کے چکر سے میری منطقی قوت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اتنا اب بھی مجھے یاد تھا کہ فلائی اوور کے ٹھیک اس طرف، بالکل پاس، میرے دوست مہتا کا گھر تھا۔ مہتا، جو برسوں میرے ساتھ پڑھا تھا اور نوکری بھی ہم دونوں نے آگے پیچھے ایک ہی محکمے میں شروع کی تھی۔ مہتا کے گھر پہنچ جانے پر میری پریشانی کم ہو سکتی ہے۔ اس کے پاس فون ہے، جس سے میں اپنے گھر کی خیریت معلوم کر سکتا ہوں۔ لیکن پہلے محفوظ طریقے سے مہتا کے گھر پہنچ جاؤں، تب تو۔

تبھی ایک خالی رکشا مجھے فلائی اوور کے ڈھلان پر اترتا نظر آیا۔ میں نے ہمت جٹا کر رکشے والے کو آواز دی۔ رکشے والے نے نشے میں چور سمجھ کر پہلے تو سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر ہمدردی کی آواز میں پوچھا، 'کدھر جانا ہے؟'

'بس نیچے فلائی اوور کے آخری سرے پر، جہاں سرکاری کوارٹرس بنے ہیں، وہیں تک پہنچا دو۔ جتنے پیسے مانگو گے، دوں گا۔ رکشا والے...... بھائی...... دیکھو......' میں نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

رکشا والا شاید میری غمناک آواز سے پسیج گیا۔ سہارا دے کر اس نے مجھے سیٹ پر بٹھایا۔

کچھ لمحے بعد ہی میں مہتا کے دروازے پر تھا۔

'پاپا آتے ہی ہوں گے، بیٹھئے انکل۔'

مہتا کی بیٹی نیلو نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتے کھولتے کہا۔

'پانی، بٹی، تھوڑا پانی......' میں نے رومال سے اپنی پیشانی پونچھتے ہوئے کہا۔ ایسا کرنا شاید میرے لئے ضروری تھا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ مہتا کی بیوی یا اس کی بیٹی میری بدحواسی کو بھانپ جائے۔ لیکن ڈیوائیڈر کی دھول بھری زمین پر بیٹھ جانے کی وجہ سے میرے کپڑوں پر جو شکن اور گرد بیٹھ گئی تھی، وہ ان کی آنکھوں سے کیسے چھپ سکتی تھی۔

پانی لے کر نیلو کمرے میں آئی تو اس نے حیرت سے میرے کرتے پاجامے پر نظر ڈالی۔

'اتنی دھول کہاں سے......انکل......اتنے دھبے؟'

'رکشے سے آیا ہوں نا، بٹی......راستے میں دھول، پھر رکشے پر جمی دھول۔ تم تو جانتی ہو، شہر کا حال۔' میں گڑبڑاتے گڑبڑاتے کسی طرح کہہ پایا۔ پھر بات بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔

'تمہارے امتحانات کب سے ہیں، یا ہو گئے؟'

'اگلے ہفتے شروع ہوں گے۔ انکل آپ کپڑے کیوں نہیں بدل لیتے، پاپا کے کرتے پاجامے تو آپ کو بالکل ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ آپ پہلے نہا لیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔ تب تک پاپا بھی ضرور آ جائیں گے۔'

میرے پاس سوچنے کو زیادہ وقت نہیں تھا۔

نہا دھو کر، مہتا کے کپڑے پہنے، جب میں ڈرائنگ روم میں لوٹا تو میز پر ناشتے کی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔

'مہتا نہیں آئے، کافی دیر ہو گئی' ، میں نے پوچھا۔

'فون وغیرہ کیا تھا؟'

'دوپہر میں آیا تھا فون۔ کہہ رہے تھے، ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ شاید تھوڑی دیر ہو لوٹنے میں۔'

تبھی مجھے گھر پر فون کر کے خیریت پوچھنے کا خیال آیا۔ ڈرائنگ روم کے ایک کنارے، ٹی وی کے پاس والی چھوٹی میز پر رکھے فون سے میں نے گھر کا نمبر ملایا۔

فون بیٹے نے ریسیو کیا۔ آواز بالکل نارمل، ہمیشہ کی طرح۔

'ممی کہاں ہیں، بیٹے؟' میری آواز اندیشوں سے گھری تھی۔ میں ہکلاہٹ کے قریب آ گیا تھا۔

'کہاں ہیں؟ اتنی دیر ہوگئی۔ کئی بار مہتا جی کا فون آیا۔ پوچھ رہے تھے، کہاں ہوں گے۔ میں نے کہہ دیا، مجھے نہیں معلوم۔ شاید کام زیادہ ہو، دفتر میں۔ یا کتابیں خریدنے چلے گئے ہوں۔'

بیوی کی آواز میں کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔

بات کرتے وقت کچن سے پریشر کوکر کی سیٹیاں صاف سنائی پڑ رہی تھیں۔

اس کا مطلب ہے، میں نے خیال کیا، گھر میں سب کچھ معمول پر اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تو پھر میرے گھر والی سڑک پر کھڑی کالے رنگ کی وہ گاڑی، جس میں میری آنکھوں کے سامنے سوار ہوئے تھے تین سیاہ نقاب پوش، ایک سفید رومال پوش اور ایک شخص، جو اپنے طور طریقے سے ان سب کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔

سکریٹریٹ سے نکلنے والے کئی راستوں سے، الگ الگ، آئے یہ پانچ لوگ بڑے سائز والی مورتی کے پاس آ کر ایک ساتھ ہو گئے تھے۔ خود میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں سیاہ رنگ کی گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ میری نظریں ہرگز دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ وہی سیاہ گاڑی، جو میں نے ابھی

ابھی فلائی اوور کے اس طرف کالونی والی سڑک پر اپنے گھر کے قریب کھڑی دیکھی تھی۔ اور جسے دیکھ کر میرا دل تمام طرح کے اندیشوں سے گھر گیا تھا۔ اور میں سوچنے کو مجبور ہو گیا تھا، کہیں یہ پانچوں سوار میری تاک میں تو نہیں۔ کہیں یہ مجھ پر حملے کے ارادے سے تو ادھر نہیں آئے۔ میری جان تو نہیں لینا چاہتے، یہ پانچ سوار!

ایک ساتھ اچانک کئی سوال دماغ میں گونجے۔

سوالوں کے بیچ، بیوی نے اپنی بات دہرائی۔

'اور دیر ہو گی کیا؟ کہاں پر ہیں؟'

میں نے میز پر ناشتے کی پلیٹیں سجائے میرا انتظار کر رہی مہتا کی بیوی کی طرف دیکھا۔ میں بیوی کو نہیں بتا سکا کہ میں مہتا کے گھر میں ہوں، اور بے حد پریشانی میں یہاں تک آیا ہوں۔ سب کچھ نارمل ہے گھر پر، تو مجھے اپنی پریشانی بتا کر بیوی اور بیٹے کو تناؤ میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ ہرگز نہیں۔

'بس تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ قریب ہی ہوں۔'

ناشتہ کرتے وقت میں نے اپنے آپ کو تناؤ سے کسی قدر آزاد محسوس کیا۔ مہتا کی بیوی اور بیٹی سے گھر باہر کی باتیں ہوتی رہیں۔ گریجویشن کے بعد کیا کرنا چاہتی ہے؟ کیا ایم اے؟ بیچ بیچ میں، مہتا کا ذکر بھی آتا رہا۔

'سرکاری کوارٹرس میں کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟ اپنی زمین پر مہتا مکان کیوں نہیں بنا لیتے؟ سرکار بھی تو لون وغیرہ دیتی ہے۔ سال چھ مہینے میں رہنے لائق مکان بن کر تیار ہو سکتا ہے۔ خواہ مخواہ ہر مہینے کرائے کی کٹوتی۔ اس سے کہیں اچھا ہے، بینک کا قرض چکانا۔ آپ مہتا کو سمجھاتی کیوں نہیں۔'

'کہتی تو ہوں، لیکن بیٹی کی پڑھائی اور شادی کا حوالہ دے کر ٹال جاتے ہیں۔ ایک دن کہہ رہے تھے، آپ لکی ہیں، بیٹیوں کی شادی کر دی۔ بیٹا بھی راستے پر ہے۔ محنتی ہے، ابھی سے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اور ایک ہم لوگ ہیں، بیٹا بیٹی دونوں کی پڑھائی نامکمل۔ پروموشن میں بھی دیر ہے۔ کئی لوگوں کے بعد اپنی باری آئے گی۔ گاؤں گھر کا خرچ دیکھنا بھی اپنے ذمے۔ بوڑھے ماں باپ کی ذمے داری الگ۔ بس یہی سب سوچ کر بات جہاں کی تہاں رہ جاتی ہے۔'

'ممی، میں تو کہتی ہوں، میری فکر چھوڑیے۔ گریجویشن کر کے کوئی نہ کوئی کام ضرور پکڑ لوں گی۔ اسپورٹس میں میرا شاندار ریکارڈ ہے، ڈھیر سارے ایوارڈس آخر کس دن کام آئیں گے۔ بھائی پلس ٹو میں اچھا کر رہا ہے۔ انجینئرنگ یا کمپیوٹر کورس میں جانا چاہتا ہے۔ پھر آپ کی کیا پرابلم رہ جائے گی؟ یہی نا کہ آپ اور پاپا کیسے کپڑے پہنیں گے اور دسہرہ دیوالی کیسے منائیں گے!'

جس خود اعتمادی اور بیباکی سے نیلو نے اپنی بات رکھی، اسے دیکھ کر میں تو سچ مچ حیرت میں پڑ گیا۔ کتنی سمجھدار بیٹی پائی ہے مہتا نے! اپنی صلاحیت پر اٹوٹ بھروسہ رکھنے والی بیٹی!

چائے کا دوسرا پیالہ ختم ہو رہا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ 'پاپا آ گئے، شاید' کہہ کر نیلو نے دروازہ کھولا۔

'انکل کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے اتنی دیر لگا دی۔ فون بھی نہیں کیا۔'

نیلو نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے مہتا سے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

'انکل، اب تو آپ کو ایک کپ چائے اور پینی پڑے گی۔ فوراً لاتی ہوں۔'

مہتا نے اپنے کندھے سے لٹکا بیگ بغل والی کرسی پر رکھ کر میری طرف دیکھا۔

'کب آئے؟'

'کافی دیر ہوئی۔ دفتر سے سیدھے ادھر ہی آ گیا۔ سوچا، دفتر میں جب سے پروموشن کا لفڑا چلا ہے، تم سے وہاں ٹھیک ٹھیک بات نہیں ہو پاتی۔ تمہاری بیوی اور بیٹی سے ملے بھی تو کافی دن ہو گئے تھے۔ لیکن تم کہاں اٹکے تھے؟'

'مجھے دیر ہو گئی۔ ایک ضروری کام سے راستے میں رک جانا پڑا۔'

'میری بیوی کہہ رہی تھی تم نے میرے گھر فون کیا تھا۔ مجھے ڈھونڈھ رہے تھے۔'

'ہاں، بس...... یوں ہی کیا تھا۔ دفتر سے آج تم پہلے ہی نکل گئے تھے، شاید۔ میں نے سوچا...... کہیں طبیعت وغیرہ تو گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اسی لئے فون کیا تھا۔ تم نہیں ملے...... تو راستے میں تھوڑی دیر دوستوں کے ساتھ ٹھہر گیا۔'

مہتا رک رک کر، دھیرے دھیرے، کچھ کچھ گھبرائی سی آواز میں بول رہا تھا۔ اچانک اٹھ کر اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ ہم دونوں کا دھیان ٹی وی پر چل رہے پروگرام میں الجھ گیا۔

بات چیت کا سلسلہ رک گیا۔

نیلو میز سے خالی پلیٹیں اور کپ ہٹا کر کچن لے جا چکی تھی۔ مہتا کی بیوی کرسی پر رکھے مہتا کے بیگ سے کاغذات وغیرہ نکال کر میز پر رکھ رہی تھیں۔ اچانک کمرے میں ان کی حیرت میں ڈوبی آواز ابھری۔ آواز اتنی تیز تھی کہ ایک لمحے کے لئے ٹی وی کا اشتہاری شور دھیما پڑ گیا۔

'یہ کیا ہے؟' بیگ سے نکلا سیاہ کپڑے کا ایک بڑا ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لئے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہتا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں نے، اور مہتا نے بھی، تقریباً ایک ساتھ، گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ

کپڑے کا وہ ٹکڑا ایک نقاب کی شکل لے چکا تھا۔

نقاب کے اگلے حصے میں، آنکھوں کے لئے، دو چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے۔

ممی کی گھبرائی آواز سن کر نیلو کچن سے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

اس سے آگے، میری آنکھوں نے دیکھنا بند کر دیا تھا!

فلاورنُوک

دروازے کے داہنی بازو والی دیوار پر کال بیل لگی ہے۔

آنے والے نے اس کا سہارا نہیں لیا۔

سیدھے دروازے پر ہی دستک دی۔

آواز ہلکی اور محتاط ہونے کے باوجود میرا دھیان کھینچنے کو کافی ہے۔

گھر میں اس وقت کوئی اور نہیں، اس لئے دروازہ مجھے ہی کھولنا پڑا۔

دروازے پر کھڑا نوجوان میرے لئے اجنبی ہے۔

میرے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے پر نہایت شائستہ لہجے میں بولا——

'فلاورنُوک' سے آیا ہوں۔ آپ کے لئے یہ گلدستہ ہے۔'

'میرے لئے! کس نے بھیجا ہے؟'

جواب میں اس نے گلدستے سے ٹنگے ایک چھوٹے سے رنگین کارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

کارڈ پر، تین چھوٹی بڑی لکیروں کے بیچ، ایک خوبصورت سا نام لکھا ہے۔

'شکریہ! انہیں میری طرف سے شکریہ کہنا'

گلدستہ لے کر میں سیدھے سونے کے کمرے میں آ گیا۔ ایک کنارے، ٹیبل کیلنڈر پڑا ہے۔

جس میں آج کی تاریخ سرخ نشان سے گھری دکھائی دے رہی ہے۔

تو یہ گلدستہ مجھے اسی تاریخ کی بدولت ملا ہے!

میں نے سوچا، مناسب تو یہی ہے کہ میں فون پر خود بھی انہیں 'شکریہ' کہہ دوں۔

صبح کا وقت ہے۔ شہروں میں، عام طور سے، لوگ اس وقت چائے پی رہے ہوتے ہیں۔ اخباروں کی سرخیاں پڑھ رہے ہوتے ہیں، یا ٹی وی کے، صبح صبح کے، کوئی خاص پروگرام دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

فون کی گھنٹی بجتے ہی، اس طرف ریسیور اٹھا —

'پھول پہنچ گئے؟'

'جی! آپ نے زحمت کی...... شکریہ۔'

'آپ نے دیکھے، میری پسند کے پھول......'

'میں سوچتا تھا، لال سرخ پھول آپ کو زیادہ پسند ہوں گے۔ لیکن آپ نے تو بالکل سفید پھول بھیجے ہیں۔ ان سفید پھولوں میں آپ کا عکس نہ جانے کتنے حسین خواب بُن ڈالے گا۔'

فون پر اس طرف سے آنے والی آواز یکا یک دھیمی ہو گئی۔

'میرا عکس...... ان پھولوں میں...... آپ کو نہیں ملے گا...... وہ تو کب کا کھو گیا ہے...... کہاں، نہیں معلوم۔ آپ انہیں تلاشنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کریں......'

'پھول بہت اچھے ہیں، خوبصورت، دلکش! میں نے انہیں سنبھال کر اپنے سرہانے رکھ لیا ہے۔ یہاں یہ ہمیشہ ہی تر و تازہ بنے رہیں گے۔آپ کی یادوں کی طرح......'

'میری یادوں کی طرح ......نہیں ......وہ تو پانی پر کھینچی گئی لکیریں ہیں ......ڈوبتی بکھرتی۔ ان خوبصورت پھولوں کو میری یادوں سے منسوب نہیں کریں......'

'لیکن مجھے تو یہ سفید سفید پھول آپ کی شخصیت کا ہی عکس نظر آتے ہیں۔آپ کی شخصیت، جو، بار بار،آپ کی یادوں میں سمٹ آتی ہے۔'

فون پر آنے والی آواز اب دھیمی نہیں رہ گئی ہے۔

'سوکھ گئے یہ خوبصورت، سفید پھول، تو انہیں کیا کریں گے......'

آواز میں تیز چلنے والی سانسوں کی شدت سما گئی ہے۔

'اتنے سفید اور نازک پھول بھلا سوکھ کیسے جائیں گے! آپ نے انہیں سوکھنے کی اجازت دی ہے۔ نہیں نا! پھر یہ سوکھیں گے کیسے!'

'میں نے دیکھا ہے، ان سے بھی زیادہ خوبصورت پھولوں کو......سوکھتے بکھرتے۔'

آواز اداسی میں بدل گئی ہے۔ بدلتی آواز مجھے بھی غمگین کر رہی ہے۔

میں بھی شاید بات چیت کرنے میں پریشانی محسوس کر رہا ہوں۔

اس روشن صبح، فون پر ہماری بات چیت ایک انام اندیشے کی نذر ہو گئی ہے!

تاریخیں بدلتی رہیں۔ ٹھیک جیسے وہ ہمیشہ بدلتی ہیں۔ دن ہفتوں سے گزر کر مہینوں میں تبدیل

ہو گئے۔ مہینے سال کی پوشاک پہنتے، اس سے تھوڑا پہلے، ایک اور روشن صبح میرے دروازے پر انجان دستک دے گئی۔ کال بیل کی جگہ، دروازے پر ہلکی سی دستک!

شائستہ، محتاط، ٹھہری سی ایک دستک!

میری آنکھوں میں جیسے اندیشوں کے چراغ جل اٹھے ہوں۔ سرہانے پڑے سفید پھولوں کے گچھے پر میری نظر گئی۔ پھول اب بھی، پہلے دن کی طرح، تروتازہ ہیں۔

حسین اور دلکش! اپنی پنکھڑیوں سے انجان یادوں کی روشنی بکھیرتے!

دروازہ کھولتے، مجھے پھر وہی نوجوان دکھائی دیا۔ آج بھی اس کے ہاتھوں میں سفید، باریک کپڑوں سے ڈھکا ایک بڑا سا خوبصورت گلدستہ ہے۔

'پھول ہیں، آپ کے لئے......'

'لیکن آج......آج کی تاریخ......'

'مجھے نہیں معلوم، بس اتنا ہی کہا......'

'میری طرف سے انہیں 'شکریہ' ضرور کہہ دینا۔ تازہ پھولوں کا شکریہ!'

اپنے کمرے میں آ کر، آدم قد آئینے کے سامنے، میں نے گلدستے کا شفاف کور ہٹایا۔

میری آنکھیں حیرت میں ڈوب گئیں۔ میرے ہاتھوں میں، تازہ کھلے، لال سرخ پھولوں کے گچھے ہیں!

وہ بھی سردیوں کی ایک روشن سی صبح تھی۔

میرے سرہانے سفید پھولوں کے ساتھ لال سرخ پھولوں کے گچھے پڑے ہیں۔

میں نے فون کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گھنٹی بجی۔

'پھول پہنچے۔ لال سرخ پھول!......آپ کی پسند کے پھول!'

'لیکن......آج......'

'پچھلی تاریخ آپ کی تھی۔ آج ہماری ہے۔ ہم دونوں کی۔ پھولوں کے رنگ پر آپ کی پسند چھا گئی ہے۔ یاد ہے، اس دن آپ نے لال سرخ پھولوں کا ذکر کیا تھا۔ جن میں آپ میری یادوں کا عکس دیکھنا چاہتے تھے۔ ہے نا!'

'جی......لیکن آپ نے یہ تاریخ مجھ سے پوشیدہ رکھی۔ مجھے جاننے بھی نہیں دیا کہ......آج......آپ کی......'

'میری نہیں......ہماری تاریخ ہے......آج۔ ہم دونوں کی۔ لال سرخ پھول کی پتیوں میں آج آپ کو ہم دونوں کے عکس نظر آئیں گے۔ آپ انہیں غور سے دیکھیں گے۔'

'میری آنکھوں میں تو آج بھی، ان سفید پھولوں کے بیچ، آپ کی یادوں کا ہی عکس قائم ہے۔ میں اپنی آنکھوں میں، ان کی جگہ، کوئی اور عکس کیسے دیکھ پاؤں گا۔'

'میری پسند کے پھول کیا اب بھی آپ کے سرہانے پڑے ہیں؟'

'جی، میرے سرہانے رکھی میز پر اب بھی سفید پھولوں کے گچھے اسی طرح رکھے ہیں۔ دلکش اور تر و تازہ! آج بھی ان میں آپ کی یادوں کی خوشبو بسی ہے۔ آج بھی میں اسی شدت سے اسے محسوس کرتا ہوں۔'

’پھول کیا اب بھی اسی طرح سفید ہیں؟......ان پر گرد کی پرتیں نہیں۔......میرا دل رکھنے کی خاطر تو آپ یہ سب نہیں کہہ رہے!‘

اچانک فون کی لائن کٹ جانے سے ہماری بات چیت ادھوری رہ گئی۔

کچھ اور مہینے گزر گئے۔ تاریخوں کی ناؤ پانی کی لہروں پر آگے پیچھے ڈولتی رہی۔ اس بیچ، فون پر ہماری آوازیں کچھ ٹوٹی ٹوٹی سی رہیں۔ رشتوں کے تار جڑے بھی، تو اسی حد تک کہ ہم نے ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر لی، یا موسم کی بے رحمی اور دل آزاری پر اپنی رائے ظاہر کر دی۔

میرے سرہانے رکھے سفید، لال سرخ پھول ان بدلتے موسموں کے گواہ بنے رہے!

اترتی سردیوں کے موسم میں، ایک اور روشن صبح!

میرے دروازے پر، تیسری بار، کوئی دستک سنائی دے رہی ہے۔

میں اپنے بستر میں ہی ہوں۔ اس امید سے پوری طرح بے خبر کہ کوئی، صبح صبح، میرے دروازے پر دستک دینے آئے گا۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر دروازے تک آیا ہوں۔ کچن میں چائے بنا رہے موہن نے دروازہ پہلے ہی کھول دیا ہے۔

دروازے پر وہی چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔

آج، لیکن، اس کے ہاتھ خالی ہیں۔ ان میں گلدستے نہیں ہیں۔

’خیریت ہے نا!‘

میں نے ’فلاورنوک‘ سے آئے نوجوان کی طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔

تھوڑی دیر وہ اپنی آنکھیں جھکائے کھڑا رہا۔ پھر محتاط اور شائستہ لہجے میں بولا ——

'خیریت...... شاید نہیں...... میں اپنے گلدستے واپس لینے آیا ہوں...... آپ کے سرہانے، چھوٹی میز پر رکھے ہیں نا وہ سفید اور لال سرخ پھول، جو انہوں نے آپ کو بھجوائے تھے......'

'لیکن......' میری بات مکمل نہیں ہو پائی۔

دروازے پر دستک دینے والا نوجوان شاید جلدی میں ہے۔

'مجھے سفید اور لال سرخ پھولوں کے گچھے لے کر فوراً لوٹنا ہے۔ سب لوگ انتظار میں ہیں۔ ان کی وصیت ہے...... یہ پھول بھی ان کے ساتھ دفن کر دیئے جائیں۔'

میں ٹوٹے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔

سرہانے رکھی میز پر سفید، لال سرخ پھولوں کے گچھے اسی طرح پڑے ہیں۔

مہینوں سے! برسوں سے! شاید صدیوں سے!

میں نے سرہانے رکھی میز سے پھولوں کے گچھے اٹھا لئے ہیں۔ ان پر سفید، باریک، شفاف کور لگایا ہے۔ ایک بار، ان پھولوں کو اپنی آنکھوں اور پیشانی تک لے گیا ہوں۔ پھر، کانپتے ہاتھوں سے، دونوں گلدستے، دروازے پر کھڑے نوجوان کو سونپ کر کمرے میں لوٹ آیا ہوں۔

آج میں نے فون پر کوئی نمبر نہیں ملایا ہے۔

آج میرے فون کی گھنٹی نہیں بجی ہے۔

آج میرے کمرے میں کچھ انام رشتوں کی دھند پھیل گئی ہے!

ایک کنارے پڑے، ٹیبل کیلنڈر کی تاریخیں ٹوٹ ٹوٹ کر، بکھر رہی ہیں!

گنگا تیرے اِکتارا

پو پھٹنے میں ابھی شاید دیر تھی۔ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بھیڑ نہیں کے برابر تھی۔ اِکّا دُکّا لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ گھاٹ کی اوپری سیڑھیوں کے آگے چبوترے پر جلنے والی میونسپل لائٹ اتنی دھیمی اور بے جان تھی کہ سیڑھیوں پر بیٹھے اکا دُکا لوگوں کے چہرے بھی پہچان میں نہیں آ رہے تھے۔

اپنے غیر ملکی دوست کیرل جون کے ساتھ آدھی رات سے کچھ اوپر گھاٹ کنارے آنے کا آج میرا ساتواں دن تھا۔ عجیب شوق لے کر آیا تھا کیرل، اس بار۔ آدھی رات، گنگا کنارے بیٹھ کر اپنی کویتائیں سنانے کا شوق۔

کویتاؤں کے بیچ آنسوؤں کی بارش، سسکیاں اور آہیں!

گیارہ سال کے وقفے پر کیرل ہندوستان آیا تھا۔ اپنی یادوں کے خزانے میں تلخیوں کا سرمایہ لئے۔ میں انکار نہیں کر سکا جب اس نے کہا کہ میں آدھی رات کے بعد گنگا کی لہروں کو گواہ بنا کر تمہیں اپنی کویتائیں سناؤں گا۔ میں اس کے درد میں ڈوبے الفاظ کے معنی سمجھ رہا تھا، اس لئے اپنی نیندیں کھو کر بھی یہاں آنے کو تیار ہو گیا۔

کیرل کی نظموں میں اس کی بے چینیاں چھپی تھیں۔ اپنی دوست سے الگ ہونے کا درد چھپا تھا۔ ان سات دنوں میں اس نے اپنی کتنی کویتائیں سنائیں، یاد نہیں، لیکن اس کی سبکیاں، سسکیاں اور آہیں ضرور یاد ہیں۔ کویتائیں سناتے وقت وہ اکثر گھاٹ کی سیڑھیاں بدلتا رہتا۔ اس کنارے سے

اس کنارے۔ لیکن پو پھٹتے ہی گھر لوٹنے کو بیتاب ہو اٹھتا۔ گھر آ کر بستر پر کچھ اس طرح گرتا کہ میری تو کبھی کبھی سانسیں ہی رک جاتیں۔ کیا ہوا اسے! کوئی سیریس بات ہوگئی تو میں کیا کروں گا! میری دھڑکنیں بڑھ جاتیں۔

آج میں نے اس سے پوچھ ہی لیا، 'کتنی کویتائیں اور بچی ہیں سنانے کو۔'

ہنس کر بولا، 'اوب گئے نا تم بھی آخر، میری ان کویتاؤں کو سن کر۔ یہی ہوتا ہے، لوگ اوب جاتے ہیں۔ زیادہ دیر رک کر کوئی میری کویتائیں نہیں سن پاتا۔ آخر کوئی یہ کویتائیں سنے گا بھی کیوں! ہر کوئی سمجھتا ہے، ان کویتاؤں میں جو درد چھپا ہے وہ میرا اپنا درد ہے، صرف میرا اپنا۔ اور کسی کو میرے اپنے اس درد سے کیا!'

'نہیں، ایسا نہیں، کل سے میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ کالج کھل رہا ہے۔ مجھے اپنی روٹین بدلنی ہوگی۔ میں شاید ساری رات یہاں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکوں۔ تم برا نہیں ماننا۔ تمہاری کویتائیں مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ بہت درد بھری، بے چین کر دینے والی کویتائیں ہیں۔'

ہم یوں ہی باتیں کرتے سیڑھیوں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک اندھیرے میں ہمارے قدم کسی سخت چیز سے ٹکرا کر تھم گئے۔ ایک عجیب سی جھنکار پیدا ہوئی اور وہ سخت چیز لڑھک کر نیچے گرنے لگی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔

یہ کیا! میرے ہاتھوں میں ایک بھیگا اکتارا تھا۔ یہ جھنکار اسی کے تاروں نے پیدا کی تھی۔

اکتارا اندر باہر سے بھیگا تھا۔ ہاتھ میں اٹھاتے ہی اندر کے پانی کی بوندیں گر گر کر ہمارے کپڑوں کو گیلا کرنے لگیں۔ دیکھنے میں اکتارا بہت پرانا لگ رہا تھا۔ ویسا نہیں، جیسا آج گلی کوچوں میں بنجاروں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔

پوری طرح سے بھیگا ہونے پر بھی اس کے تار ڈھیلے نہیں پڑے تھے۔ انگلیوں کی ذراسی حرکت سے ہی تار بج اٹھتے تھے۔

'واہ، کیا آرگن ہے! اب میں اپنی کویتائیں تمہیں اس کے ساز پر ہی سناؤں گا۔ تم اسے بجانا، میں گاؤں گا۔'

میں خاموش رہا۔ میں جانتا تھا، مجھے اکتارا کے تاروں سے کھیلنا تو آتا ہے، اسے قائدے سے بجانا نہیں۔ لیکن کیرل میری بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ضد پکڑ لی۔ مجھے اکتارا اپنے ہاتھوں میں سنبھالنا ہی پڑا۔ درد بھری آواز میں کیرل نے اپنی کویتا سنانی شروع کی۔

تبھی اچانک کسی نے اوپر کی سیڑھیوں سے میری پیٹھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ رات کی تاریکی، گھاٹ پر پسرا سناٹا اور ویرانی! میں ڈر سا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت ایک لمحے کے لئے جاتی رہی۔

اکتارا اچانک بند ہوتا دیکھ کیرل کی کویتا بھی جیسے رک گئی۔ سیڑھیوں پر اپنے پیر پسارے، گنگا کی لہروں کو گواہ بنا کر اپنی کویتائیں سناتا کیرل جیسے گہرے خواب سے اٹھا ہو۔ اپنی چھوٹی ٹارچ جلا کر اس نے پہلے میرا چہرا دیکھا۔ پھر میری پیٹھ پر رکھے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔

'آپ کون؟' کیرل نے پوچھا۔

'میں کبیر ہوں، کبیر جولاہا! یہ جو اکتارا تمہارے ہاتھ میں ہے، وہ دراصل میرا ہی ہے۔'

نام سنتے ہی میرا خوف ایکبارگی دور ہو گیا۔ اٹھ کر میں نے اپنے ہاتھ جوڑے اور کہا، 'بھگون! معاف کریں۔ یہاں سیڑھیوں پر پڑا تھا آپ کا اکتارا۔ اندھیرے میں میرے قدموں سے ٹکرا گیا

تھا۔ میری کوئی غلطی نہیں بھگون، مجھے معاف کردیں۔'

'غلطی نہیں، میں جانتا ہوں۔ معافی کس بات کی! مجھے دینا میرا اکتارا، میں بجاؤں گا اسے۔ پھر تم اپنی کویتائیں سنانا۔ تم، یعنی تم دونوں۔'

کیرل کی آنکھیں حیرت سے بھر گئیں۔

کبیر صاحب اس کی آنکھوں کے سامنے بیٹھے ہوں گے، اکتارا ان کے ہاتھوں میں ہوگا، ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ سارا منظر ایک کرشمے کی طرح اس کی نظروں میں گھوما۔ جھجھک کے ساتھ کیرل نے اپنی کویتا شروع کی۔ اس کے الفاظ کبیر صاحب کی انگلیوں کی جنبش میں کھو گئے تھے۔ آواز کا درد اکتارے کی جھنکار میں بدل گیا تھا۔

کتنی دیر، گنگا کنارے، سیڑھیوں پر، دوہرے درد کی یہ آوازیں گونجتی رہیں، کسی کے دھیان میں نہیں۔ ایک عجیب وغریب طلسم چھایا تھا پورے ماحول پر۔ آوازیں رکتی تھیں تو گنگا کی بے تاب لہروں پر چھائی بےچینی ایک شور بن کر ابھرتی محسوس ہو رہی تھی۔

کیرل جب آخری کویتا سنا چکا، کبیر صاحب اپنی جانی پہچانی آواز میں گانے لگے:

جب انکھین میں نیند گھنیری
تکیہ اور بچھونا کیا رے
کہے کبیر پریم کا مارگ
سر دینا تو رونا کیا رے

مجھے اچھی طرح یاد ہے، کبیر صاحب کی آواز جب تھمی تو گنگا کنارے کی سیڑھیوں پر اشنان کے لئے

آنے والوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ سب کے سب کبیر صاحب کی آواز سے کھنچے اسی کنارے آبیٹھے تھے۔ ان میں تمام عمر کی عورتیں تھیں اور مرد بھی۔ لوگ آہستہ آہستہ کبیر صاحب کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔

'بھگون! ہمارے نصیب سے آپ یہاں آگئے۔ ہم کتنے کتنے برسوں سے آپ کے درشن کو ترستے رہے ہیں۔ آپ کی آواز گنگا کنارے، اس گھاٹ پر، کتنی مدت کے بعد سنائی دے رہی ہے، بھگون! اب آپ یہ کنارا چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو ہمیشہ یہیں، اسی گھاٹ کی سیڑھیوں پر اکتارا بجاتے اور اپنے دوہے سناتے دیکھنا چاہتے ہیں۔'

کبیر صاحب نے اکتارا اپنے داہنے بازو رکھ دیا۔ سفید گُچھے سے اپنا چہرا پونچھا، اپنی آنکھیں صاف کیں۔ پھر بولے، 'لیکن میں تو بس آج ہی اپنے گاؤں لوٹ جاؤں گا۔ میرا یہاں کا کام پورا ہوگیا۔'

'کیا کام تھا، بھگون، جو پورا ہوگیا'، میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

'اتنا سا کام تھا۔ اپنا جو یہ اکتارا ہے نا، اسے گنگا جل سے دھونا تھا۔ الٹی سیدھی بانی بولتے بولتے اس کے تاروں پر سیاہی سی پھیل گئی تھی۔ گنگا جل سے دھوئے بغیر یہ سیاہی دور نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا، گنگا کے درشن بھی ہو جائیں گے اور اکتارے کی سیاہی بھی دھل جائے گی۔'

بھگون بس اتنا ہی بولے۔ پھر اکتارا اٹھا کر گھاٹ کی سیڑھیاں اتر گئے۔

سیڑھیوں پر بیٹھے لوگوں نے دیکھا، کبیر صاحب اکتارا سنبھالے گنگا کی لہروں پر چل رہے ہیں۔ ایک سے زیادہ بار انہوں نے اکتارے کو گنگا کی لہروں میں ڈبویا۔

الٹی سیدھی بانی بولتے بولتے جو سیاہی اس کے تاروں پر پھیل گئی تھی، اسے دھونے کے لئے کبیر صاحب اپنا وجود بھگوتے گنگا کی لہروں پر آگے بڑھتے گئے۔ بڑھتے گئے۔

دور افق سے پو پھٹنے کے اشارے ملنے لگے تھے۔

میں نے مڑ کر کیرل کی طرف دیکھنا چاہا۔

کیرل گھاٹ کی سیڑھیوں پر بے ہوش پڑا تھا۔

اس کے ہاتھوں کی ٹارچ پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔

گھاٹ کی سیڑھیوں پر جمے لوگ اب بھی کبیر صاحب کے لوٹنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔

گنگا کی اوپری سطح پر، دور دور تک کبیر صاحب کے اکتارے کی سیاہی پھیل گئی تھی!

دھوئیں کی بو

'میں کہتا ہوں، اب اسے آگے پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ پیسہ برباد کرنا ہے۔ ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔ جلسے جلوس میں شریک ہوتا ہے۔ کسی دن پولس کی گولی سے مارا جائے گا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں، اسکول سے نام کٹوا دو، چھوٹی بوبو......'

ماما جی نے دھیمی آواز میں کچھ اس طرح اپنی بات کہی کہ اماں کے علاوہ کوئی اور اسے نہیں سن سکا۔ بہنیں بھی اپنے کام میں اس قدر مشغول تھیں کہ ماما جی کی تجویز انہیں سنائی نہیں پڑی۔

'مگر نام کٹوا کر کرے گا کیا؟ پھر پڑھائی میں تو ہمیشہ اول آتا ہے۔ کبھی پیچھے نہیں رہا۔ یہی تو حیرت کی بات ہے۔ ایسے میں پڑھائی چھڑانا ٹھیک ہے کیا؟'

اماں نے اپنے چھوٹے بھائی سے نا اتفاقی جتائی۔

'پھر سوچو، چھوٹی بوبو، پڑھانے کی بجائے اسے ابھی سے کسی کام پر لگا دو۔ میرے علاقے میں مگہی پان کی بہت اچھی کھیتی ہوتی ہے۔ اپنے بھی نو دس گاؤں میں پان کی بڑی کھیتی ہے۔ پٹنہ سے لے کر کلکتہ بنارس لکھنؤ تک سے علاقے کے مگہی پان کی مانگ آتی ہے۔ میں کہتا ہوں، اسی کام میں لگا دو۔ راجگیر، اسلام پور سے پان کی تھوک سپلائی کا انتظام میں خود کر دوں گا۔ اچھی کمائی ہونے لگے گی۔ تھوڑے دنوں میں رم جائے گا۔'

ماما جی چھوٹی بو بو کی زمین جائداد کے مختار عام تھے۔ وہ ان پر حد درجہ بھروسہ کرتی تھیں۔

اپنی تجویز پر چھوٹی بو بو کو رضا مند نہیں ہوتے دیکھ ماما جی نے دوسرا پتہ کھولا۔

'یہ بھی دیکھو کہ گھر میں تین تین بیٹیاں ہیں۔ ایک کی شادی کی عمر ہو رہی ہے۔ کچھ برسوں میں اور دو بیٹیوں کی شادی کرنی ہے۔ پیسے کہاں سے آئیں گے؟ بھائی صاحب بھی جلد ہی ریٹائر ہونے والے ہیں۔ پھر مٹھی بھر پنشن سے گھر چلانا مشکل ہو جائے گا۔'

اماں اس بار کچھ پسیجتی محسوس ہوئیں۔ سوچ کر بولیں —

'تمہاری بات تو جچتی ہے بھائی...... لیکن مجھے پان کی دکان کھولنے کی تجویز ٹھیک نہیں لگتی...... پھر انہیں کون سمجھائے گا؟ نہیں مانیں گے۔ میں جانتی ہوں، کسی قیمت پر نہیں مانیں گے۔'

'کیسے نہیں مانیں گے، ایک بیٹے کو چشمے کی دکان پر بیٹھایا ہے کہ نہیں؟ دل لگا کر کام سیکھ رہا ہے، اور پیسے بھی کچھ نہ کچھ کما ہی لیتا ہے۔ میں تو صاف کہتا ہوں، بچوں کی پڑھائی پر پیسے خرچ کرنا بیکار ہے۔ ابھی سے انہیں کسی کام دھندے میں لگا دینا ہی مناسب ہوگا۔'

اس بار، ماما جی کی بات کا آخری کچھ حصہ دالان سے گزر رہی بڑی بہن کے کانوں میں پڑ گیا۔ جھٹ سے پوچھ بیٹھی —

'کس کے کام دھندے کی بات ہو رہی ہے، اماں۔'

'تیرے سننے کی بات نہیں، جا کر اپنا کام کر۔'

ماں نے تیور دکھاتے ہوئے کہا۔

کہنے کو بڑی بہن دالان سے ہٹ گئی، مگر 'کام دھندے' کی بات اس کے دماغ میں جیسے اٹک گئی

ہو۔ کس کے کام دھندے کا تذکرہ کر رہے تھے ماما جی اماں سے، کس کو کام پر لگانے کا مشورہ دے رہے تھے؟ اور ماں نے آخر اس طرح ڈانٹ کر اسے کیوں ہٹا دیا؟

منہ بناتی ہوئی بڑی بہن دالان کے ایک کنارے والی کوٹھری میں داخل ہوئی، جہاں چھوٹی بہنیں سیوئی بنانے کی تیاری میں جٹی تھیں۔

'ماما جی ماں سے کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ کسی کو 'کام دھندے' پر لگانے کی بات کہہ رہے ہیں۔ پوچھنے پر ماں نے ڈانٹ کر مجھے ہٹا دیا۔ کیا بات ہو سکتی ہے؟'

بہنوں نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ ایک نے کہا —

'جیسے منجھلے بھائی کو کام پر لگا کر دکان میں بٹھا دیا۔ اب کسے کام پر لگانا چاہتے ہیں؟'

تبھی میں کتابیں سنبھالے گھر میں داخل ہوا۔ ماما جی کو دالان میں ماں کے پاس بیٹھے دیکھ کر پہلے تو چونکا، پھر سیدھے انہیں کے پاس پہنچا۔

'ارے ماما جی، آپ کب آئے؟ ہمارے لئے رسیاؤ لائے ہیں نا؟'
میں جانتا تھا، ماما جی جب بھی گاؤں سے آتے، رسیاؤ کی ہانڈی ان کے ساتھ ضرور ہوتی۔

'اس بار نہیں لایا بیٹا۔ باہر باہر آیا ہوں۔ کورٹ کچہری کے کام سے۔ اگلی بار ضرور لاؤں گا۔'

ماما جی میں میری ساری دلچسپی جیسے ختم ہو گئی۔

'امتحان کب ہے، تیرا؟' ماما جی نے پوچھا۔

'امتحان کب کا ہو گیا۔ آج تو رزلٹ بھی آ گیا۔'

'کیا ہوا رزلٹ؟' ماما جی نے پوچھا، اس امید کے ساتھ کہ رزلٹ میں میں ضرور ہی فیل ہوا ہوں گا۔

'فرسٹ ہوا ہوں، تینوں سیکشن ملا کر، پرنسپل نے اسپیشل انعام دیا ہے۔'

میں نے دلچسپی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

جواب سنتے ماما جی کے چہرے پر برف کی سل چڑھ گئی۔

جیکٹ کی جیب سے بیڑی نکال کر سلگانے لگے۔

مجھے محسوس ہوا، ماما جی بیڑی نہیں میرا رزلٹ شیٹ سلگا رہے ہیں۔

رزلٹ کی خبر نے بہنوں میں خوشی بھر دی۔ وہ ایک دم سے بھول گئیں کہ تھوڑی دیر پہلے ہی ماما جی کی 'کام دھندے' کی بات سے کن اندیشوں میں گھر گئی تھیں۔

'اب آگے کتنی پڑھائی کرنی ہے۔ کوئی کام دھندے کی بات سوچ۔ پڑھائی کا خرچا کون اٹھائے گا۔ بہنوں کی شادی کے لئے پیسے جٹانے ہیں۔ بھاری مشکل آنے والی ہے۔' ماما جی نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

'لیکن میری پڑھائی پر خرچ ہی کیا آتا ہے؟ فیس پوری کی پوری معاف ہے۔ اوپر سے ہر مہینے اسٹائپنڈ ملتا ہے۔ کتابوں پر بھی الگ سے کوئی خرچ نہیں۔ مجھے تو اپنی پڑھائی پوری کرنی ہے۔ ابھی اور کچھ نہیں سوچنا۔'

میں نے جیسے ماما جی کا سپنا ہی توڑ دیا ہو!

'چھوٹی بوبو، تم نے بچوں کو بہت آزادی دے رکھی ہے۔ تمہارے کہنے میں نہیں ہیں سب۔'

مجھے اچھی طرح یاد ہے، اماں نے میری بھرپور طرفداری کرتے ہوئے ماما جی کی تجویز ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ماما جی کو ہارتی ہوئی بازی پر داؤ کھیلنے کی عادت نہیں تھی۔ خاموش ہو کر دالان میں ٹہلنے لگے۔ گھر بھر کو بیڑی کے تیز تیز کش کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

ادھر، دالان میں، دھوئیں کی بو پھیل رہی تھی۔

بہنوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کی۔

ان کے چہرے پر اطمینان کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

اس شام، جب ابو گھر آئے تو ماما جی نے اچانک ہی رزلٹ میں میرے فرسٹ آنے کی خوشخبری دیتے ہوئے اپنی بات شروع کی۔

ابو نے ڈھکے چھپے پیار کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ پھر بولے —

'اب زور شور سے فائنل امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ اچھا رزلٹ ہو جائے تو کسی بڑے کالج میں داخلہ آسانی سے ہو جائے گا۔ پرنسپل شریواستو کہہ رہے تھے، کالج کی پوری پڑھائی کا خرچ سرکار اٹھائے گی۔'

پڑھائی کے خرچ کی بات سن کر ماما جی کو پیسوں کی تنگی اور گھر کی اقتصادی پریشانیوں کی یاد ہو آئی۔ انہیں امید کی ایک نئی کھڑکی کھلتی نظر آئی۔

'سوال صرف اس کی پڑھائی کے خرچ کا نہیں ہے۔ گھر میں اور ذمے داریاں بھی تو نپٹانی ہیں۔ بیٹیوں کی شادی کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں بھی تو سوچیں۔ پھر آپ کا ریٹائرمنٹ بھی

نزدیک ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا، آمدنی کے اور راستے تلاشنے چاہئے۔ آج کل پڑھائی لکھائی میں کیا رکھا ہے۔ پڑھ لکھ کر بھی تو بے روزگار ہی رہنا ہے۔ بڑی بو بو کے بیٹے کو ہی دیکھیں۔ پٹنہ میں رہ کر بی اے پاس کیا۔ مگر روزگار ندارد۔ ہار مان کر گاؤں گھر بیٹھ گیا۔ اب کھیت پتھار کی رکھوالی کرتا ہے۔ ایسی پڑھائی سے کیا حاصل!'

میں دالان میں کھڑا ماما جی کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ ابو کے سامنے میری زبان مشکل سے کھلتی۔ لیکن میرے چہرے کے تیزی سے بدلتے رنگ دیکھ کر کوئی بھی میرے اندر اٹھنے والے طوفان کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

دالان کے کنارے کنارے بیٹھی کھڑی بہنوں کو ابو کا جواب سننے کی بے چینی تھی۔

اماں رسوئی میں کھانا پروسنے کی تیاری کر رہی تھیں۔

کھانا لگ گیا، تو ابو نے اپنی خاموشی توڑی —

'تمہارا بڑا بیٹا پٹنہ کے کسی کالج میں پڑھتا ہے نا؟ کس کلاس میں ہے؟'

ماما جی کو جیسے کاٹھ مار گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے بے حد سنجیدہ ہو گئے۔

پھر کسی طرح ہمت جٹا کر بولے —

'میں تو اس کو پڑھائی روک کر گاؤں گھر لوٹ جانے کو کہتا ہوں۔ مفت میں ہر مہینے ہزاروں ہزار گیلے کر رہا ہے۔ میں دباؤ دیتا ہوں کہ گاؤں آ کر کھیتی باڑی سنبھالے۔ پڑھائی کو رام رام کہے۔ ابھی سے، کھیتی باڑی کا حساب نہیں دیکھے گا تو کل ہو کر یہ ذمہ داری کیسے سنبھالے گا۔ دنیا بھر کا کیس مقدمہ، زمین جائداد کو لے کر، چلتا رہتا ہے۔ گاؤں گھر میں بھی پہلے والی بات نہیں رہی۔ بھائیوں

میں من مٹاؤ رہتا ہے۔ اکیلے مجھے ہی سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ سوچتا ہوں، اگلے سال اسے ضرور کسی طرح گاؤں آنے کے لئے تیار کرلوں گا۔'

'نہیں، یہ بات ٹھیک نہیں۔ کم سے کم، بی اے تو کر لینے دو۔ پھر سوچنا۔'

دالان کے کنارے کنارے کھڑی بہنوں کو ابو کے جس جواب کا دیر سے انتظار تھا، وہ شاید انہیں مل گیا۔ سب نے سکون کی سانس لی۔

اگلی صبح ماما جی کو لوٹنا تھا۔

جاتے وقت، ماما جی نے میرے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا ——

'معاف کرنا بیٹا، میں تیری پڑھائی ختم کرانے کے ارادے سے آیا تھا۔ میرا ارادہ فیل ہوگیا۔ آگے میں تجھے کام دھندے میں لگانے کی بات نہیں کروں گا۔'

مجھے یاد ہے، بولتے وقت ماما جی کی آنکھوں میں کچھ بوندیں چھلک آئی تھیں۔

لیکن میں فیصلہ نہیں کر پایا، یہ بوندیں احساسِ ندامت کی تھیں، یا پشیمانی کی!

آخری راؤنڈ کا کھیل

مقابلہ آخری دور میں تھا۔ پہلے دو راؤنڈ برابری میں رہے تھے۔ تیسرا یعنی آخری راؤنڈ فیصلہ کن تھا۔ سب کی نظر روشی کی سدھی ہوئی انگلیوں پر تھی۔

اپنے الجھے، بے ترتیب بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے روشی نے اپنے مقابلے بیٹھی نورا کو ایک بار غور سے دیکھا اور اپنی فیصلہ کن پاری کھیلنے کو تیار ہوگئی۔ وہ جانتی تھی، آخری دور کی ذراسی چوک بھی اسے چیمپین شپ کے خطاب سے دور کردے گی۔ سنبھل کر کھیلنا اور اپنی انگلیوں کو بورڈ پر سادھے رکھنا جیت کے لئے لازمی تھا۔ لیکن جانے کیوں آج اس کا دل کسی گہری اداسی میں ڈوبا تھا۔

صبح پوری تیاری کے ساتھ وہ گھر سے نکلی تھی۔ مما نے پیار سے ناشتہ کھلایا تھا، دودھ کا پیالہ تھمایا تھا اور بارلکس کی بوتل۔ جب تک روشی پوجا گھر میں تھی، مما دروازہ تھامے کھڑی رہی، اس کے سر پر اپنے سفید آنچل کا سایہ کئے۔

پوجا ختم ہوچکی تھی کہ باہر کھانے کی میز پر رکھے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ بے چین قدموں سے روشی فون کی طرف بڑھی۔ فون اٹھاتے ہی گھنٹی بند ہوگئی۔ لائن کٹ گئی تھی۔ روشی نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ فون اسی کا تھا۔ اپنی طرف سے اس نے دو تین بار نمبر ملانے کی کوشش کی۔

ہر کوشش ناکام رہی۔

روشی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

ساڑھے نو بجے تک تمام کھلاڑیوں کو اسٹیڈیم پہنچنا تھا۔ پونے نو بج چکے تھے۔

ماں کے ہاتھوں سے دو چار نوالے منہ میں ڈال کر اس نے دودھ ہارلکس کا پیالہ حلق میں انڈیلا۔ سیل فون اٹھا کر بیگ میں رکھا اور اوپری منزل کی سیڑھیاں لانگھتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

نیچے روشی کا بھائی اسکوٹر لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

'تیز چلو، بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔' روشی نے کہا۔

پچھلے دنوں موسلا دھار بارش کے سبب راستے میں جمع پانی سے اسکوٹر کو بچاتے ہوئے وہ دونوں بڑی سڑک پر آ گئے، جہاں سے کچھ منٹوں میں ہی اسٹیڈیم پہنچا جا سکتا تھا۔

اچانک روشی کو بیگ میں رکھے سیل فون کی ہلکی گھنٹی سنائی پڑی۔

بیگ کھول کر اس نے سیل نکالا ہی تھا کہ آواز بند ہوگئی۔ اسکرین پر نمبر اسی کا تھا۔

مس کال کا نمبر ملانے میں وہ اس بار بھی ناکام رہی۔ ٹاور سے ٹیپ کیا ہوا میسیج آتا رہا — 'کالڈ نمبر ابھی بزی ہے، تھوڑی دیر بعد ڈائل کریں۔'

تھوڑی دیر بعد، وہ اسٹیڈیم کے گیٹ پر تھی۔

اس کا بھائی اسے اتار کر 'گڈ لک' کہتا ہوا گھر لوٹ گیا تھا۔

اسٹیڈیم کے مین لاؤنج میں ہی تمام کھلاڑیوں سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اچھی خاصی چہل پہل تھی چاروں طرف۔ لیکن روشی کا دھیان کہیں تھم نہیں رہا تھا۔ پوری طرح دماغ سیل فون پر ٹکا تھا۔ بار

باراس کی انگلیاں اس ایک نمبر پر رینگ رہی تھیں ۔لیکن ادھر سے وہی ایک ٹیپڈ میسیج ——

'تھوڑی دیر بعد ڈائل کریں '

روشی حددرجہ مضطرب ہو رہی تھی ۔

رات اس نے فون پر کہا تھا —— 'میری نیک خواہشات تو ہیں ہی تمہارے ساتھ ۔ جیت تمہاری ہی ہوگی ۔ میری آنکھیں تمہیں چیمپین شپ ٹرافی جیتتے دیکھ کر ہی بند ہوں گی ۔تم پوری خوداعتمادی کے ساتھ کھیلنا۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں ۔ بالکل ٹھیک ہوں، میری فکر نہیں کرنا '

لیکن آج صبح سے فون پر اس سے بات نہیں ہونے کے سبب روشی کسی انجانے خوف سے پریشان تھی ۔آخر مس کال کا مطلب کیا ہے ۔اس کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی ۔اس پر بے ہوشی کے دورے تو نہیں پڑے ۔طرح طرح کے خیال دل میں آتے رہے ۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا، مقابلہ سے خود کو باہر کر لے ۔اور بھاگتی ہوئی اس کے پاس پہنچ جائے ۔لیکن اس کا موقع نہیں تھا۔ منتظمین اسے تلاشتے لاؤنج میں آگئے تھے ۔

'بورڈ تیار ہے ۔تم یہاں کیا کر رہی ہو؟' ٹورنامنٹ کے سکریٹری نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

'بس آگئی سر ۔گھر سے مما کا فون آگیا تھا ۔ایک منٹ میں آئی، آپ برائے مہربانی چلیں '

ٹورنامنٹ ہال میں داخل ہونے سے پہلے روشی نے اور ایک باراس کا نمبر ڈائل کرنے کی کوشش کی ۔ہلکی 'بیپ' سنائی دی تو اسے لگا اس بار لائن ضرور مل جائے گی اور وہ اس کی آواز سن کر ہی بورڈ پر مقابلے کے لئے اترے گی ۔لیکن ایک لمحہ بعد ہی 'بیپ' دوبارہ بزی ٹون میں بدل گئی ۔

روشی جب ٹورنامنٹ ہال میں داخل ہوئی، اس کا دل گہرے اندیشے سے گھرا تھا۔ انگلیوں میں

لرزش کی کیفیت تھی۔ آنکھوں پر چڑھے پاور والے چشمے کے گلاس پر اوس جیسی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ بورڈ کے چاروں طرف کھڑے درشک بھی اسے اچھی طرح نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح میں مقابلے میں کیسے شامل ہوسکوں گی، اس نے سوچا!

اسٹرائک کرتے وقت میری کانپتی انگلیاں کیا توازن رکھ پائیں گی!

روشی کو محسوس ہوا، اسے ٹورنامنٹ سے باہر ہو جانا چاہئے، کوئی بہانہ بنا کر۔ سر میں چکر، متلی یا کوئی اور حیلہ۔ اس کے مقابلے سے باہر ہونے کا مطلب ہوگا نورا کی ایک طرفہ جیت اور چیمپین شپ کا خطاب۔ کیا فرق پڑتا ہے، نورا ہی چیمپین ہو جائے تو۔ وہ بھی تو آخر اچھی کھلاڑی ہے۔

حال میں ہی ایشین ٹورنامنٹ میں اس کا سامنا نورا سے ہوا تھا، جس میں نورا دوسرے نمبر پر تھی۔ جیت جائے نورا ہی تو کیا حرج!

میچ شروع کرانے کے لئے منیجر آ چکے تھے۔

بورڈ کے اوپر تیز دودھیا روشنی کے بلب جل گئے تھے۔

روشی کو یاد نہیں رہا کہ سیل فون اب بھی 'آن' حالت میں اس کے ہاتھ میں ہی ہے۔ انتظام کاروں کے ذریعہ مائک پر سیل فون بند کرنے کی ہدایت دیئے جانے پر ہی اسے اس کا دھیان آیا۔

ٹھیک تبھی سیل فون کی گھنٹی بجی اور ایک لمحہ بعد بند بھی ہوگئی۔

روشی نے تڑپ کے ساتھ سیل پر نظر ڈالی۔ اسکرین پر وہی نمبر جیسے رک سا گیا ہو۔

میچ شروع تھا۔ روشی کی آنکھوں میں نمی کے جو سائے ابھر آئے تھے، وہ پہلے راؤنڈ میں اس کی

شاندار جیت کے بعد بھی نہیں اترے۔ نورا نے ہاتھ ملا کر اسے مبارکباد دینا چاہی تو اس کی ہتھیلیاں جل اٹھیں۔ تیز بخار اور آنکھوں کی جلن سے روشی کا بدن کانپ رہا تھا۔

میچ کا دوسرا راؤنڈ نورا کے حصے میں رہا۔ اس وجہ سے درشکوں کی دلچسپی آخری راؤنڈ میں بڑھ گئی تھی۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ اسٹرائکر کی آواز کے بیچ درشکوں کی سانسیں آسانی سے محسوس کی جا سکتی تھیں۔ ہال کبھی کبھی تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھتا تھا۔

آخری راؤنڈ کے پہلے تھوڑا سا وقفہ تھا۔ انتظام کاروں نے چائے کافی کی مہلت دی تھی۔

بریک میں روشی نے سیل فون 'آن' کر دیا۔ فون 'آن' ہوتے ہی اسکرین پر پہلے سے اسٹور کیا میسج ابھرا— 'آئی ایم وِتھ یو، ڈیر۔ بیسٹ آف لک، ناؤ اینڈ ایور' میسج کے بعد اس کا نام درج تھا۔

آخری راؤنڈ روشی کے لئے اتنا آسان اور ہلکا ہو سکتا ہے، درشک سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ کھیل روشی نے شروع کیا تو اسے جیت کی منزل تک لے جانے کا سپنا بھی اس کی باریک اور خوبصورت انگلیوں نے ہی پورا کیا۔

چیمپین شپ ٹرافی لے کر ہال سے نکلتے نکلتے وہ کیمرہ والوں سے گھر گئی۔ رپورٹروں نے 'آگے آپ کی منزل کیا ہے' جیسے سوال پوچھے۔ روشی نے سسکیوں کے بیچ آدھے ادھورے جواب دیئے اور بھاگتی بھاگتی لاؤنج کے ایک کنارے نکل آئی۔ پھر بیگ سے سیل فون نکال، اسے آن کیا۔

نمبر ڈائل کرنا ہی چاہتی تھی کہ سیل فون کے اسکرین پر اس کا نمبر ابھر آیا اور گھنٹی بجنے لگی۔

کانپتے ہاتھوں سے روشی نے فون کھولا، اور اس سے پہلے کہ ادھر سے کوئی آواز آئے، وہ بول اٹھی — 'میچ کے دوران آپ میرے ساتھ تھے نا، اسی لئے میں جیت گئی۔ ٹرافی لے کر ابھی

سیدھے آپ کے پاس آرہی ہوں ...... بس ابھی ...... میں بہت خوش ہوں ...... لیکن بہت دکھی بھی ہوں ...... سویرے سے بات کرنے کو بے چین ہوں ...... فون ...... لیکن ......'

ادھر سے کسی نے روشی کی بات کاٹتے ہوئے کہا — 'لیکن ...... بے بی جی ...... بھیا ...... آج سویرے گزر گئے۔ سینے میں بے حد تکلیف تھی۔ بار بار آپ کو فون لگاتے تھے۔ آنکھ بند کرنے سے پہلے کہا، شام سے پہلے میرے مرنے کی خبر روشی کو نہیں دینا، آج اس کا فائنل میچ ہے ...... بھیا کی لاش کل صبح ان کے گاؤں جائے گی۔ وہیں دفن ہوں گے ......'

فون پر زاروقطار رونے والی یہ آواز اس کے نوکر حاکم کی تھی۔
سیل فون کا اسکرین گہری خاموشی میں ڈوب گیا تھا!

مرگنگا میں ڈوب

گھوسوری سے سر میرا ہو کر بربیگھہ اور اس کے آگے تک جانے والی سڑک، جگہ جگہ نالے میں تبدیل ہوگئی ہے۔ نالے کی گہرائی ناپنے کی کوششیں کئی بار ہوئی ہیں۔ لیکن ہر بار یہ کوشش ادھوری رہی ہے۔ اب تو خطرہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ دن کے وقت بھی کوئی چار پہیہ گاڑی اس راستے ہو کر نہیں گزرتی۔ سائیکل سوار تک چلنا جوکھم مانتے ہیں۔

جہاں سے سڑک پر نالوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہاں سے دو ڈھائی کیلومیٹر پورب، دھنک ڈوبھ سے آگے، ٹال میں جنے منگلی ماتا کی پیڑی نصب ہے۔ پیڑی کے پاس میں ہی کھڑے ہیں، نیم، بڑ اور پیپل کے پرانے پیڑ، جن کے تنے بظاہر مضبوط اور دمدار دکھائی دیتے ہیں، لیکن جن کی اوپری سطح کے چاروں طرف کی مٹی، کہیں کہیں، بھسک گئی ہے۔

مٹی بھسکنے سے ہی جڑوں کے زمینی ریشے باہر جھانکنے لگے ہیں۔

جنے منگلی ماتا کی پیڑی پر آنے والے شردھالوؤں کی بھیڑ میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

ہمیشہ کی طرح، آج بھی، وہاں بھکتوں کا میلا لگا ہے۔ منتیں مرادیں مانگنے کا دور ہے۔

ٹال واسی مانتے ہیں، جنے منگلی ماتا کی کرپا ہوگی، تبھی گاؤں میں امن چین قائم رہے گا۔ تبھی ٹال کی مٹی نرم ہوگی، دھرتی سنچے گی اور فصلیں بوئی جا سکیں گی۔

جئے منگلی ماتا نے نظریں پھیرلیں تو ٹال کی وسیع زمین کا آنچل تارتار ہو جائے گا اور کسانوں کی بوریوں کے بیج یوں ہی سوکھ کر بکھر جائیں گے۔

ٹال واسی اچھی طرح جانتے ہیں، جئے منگلی ماتا کے آشیرواد کے بغیر ان کا کوئی کام پورا نہیں ہوتا۔ گھنٹوں گھنٹوں کی کسانی کے بعد ان کا ماتا کی پیڑی پر آبیٹھنا صرف ماتا کے لئے ان کی عقیدت کی علامت نہیں ہے۔ یہی تو ایک جگہ ہے، جہاں وہ عقیدت مندی کے علاوہ اپنے گلے شکوے لے کر آتے ہیں۔ بے انتہا صبر وضبط اور ممتا کی مورتی، جئے منگلی ماتا ان کے سارے گلے شکوے سنتی ہیں اور انہیں ایک نئی امید اور خوشی سے بھر بھر دیتی ہیں۔ ماتا کی شرن میں آنے والے عقیدت مندوں کی ساری تکلیفیں اور تھکان جیسے ایکبار گی مٹ جاتی ہیں۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے اپنے ٹولے محلے لوٹ جاتے ہیں۔

لیکن ماتا کی اس پیڑی پر آج جب ٹال کے باشندوں کا ہجوم پہنچا تو انہیں چاروں طرف ویرانی اور سناٹا دکھائی پڑا۔ عام دنوں کا جوش انہیں آج وہاں محسوس نہیں ہوا۔

سناٹے کو دیکھ کر، کوئی ٹال واسی بھیڑ کے بیچ سے بولا — 'ماتا ناراض ہیں ہم سے۔ ماتا نے اپنا آشیرواد سمیٹ لیا ہے۔ تبھی تو ٹال میں سوکھا پڑا ہے۔ ایک بوند پانی نہیں ہے یہاں۔ زبردست اکال پڑنے والا ہے۔'

'لیکن کیوں، ماتا ہم سے ناراض کیوں ہوں گی؟ ہم سے آخر غلطی کیا ہوئی ہے؟ ہم تو ہمیشہ یہاں ماتا کی پیڑی پر سر جھکاتے ہیں، اپنی پریشانی سنا کر ان کا آشیرواد لیتے ہیں۔ ماتا ہم سے ناراض کیسے ہو سکتی ہیں؟'

'کیوں نہیں ہوں گی ناراض ماتا ہم سے؟'

بھیڑ میں شاید سب سے بڑی عمر کے تھے جامن مہتو، جو اپنی زبان بند نہیں رکھ پائے۔ ایکدم سے پیڑی سے اٹھ کر بدحال پیڑوں کے پاس آ گئے اور بولے --

'حالت دیکھو ان پیڑوں کی۔ ہم نے ان کی مٹی تک کھود ڈالی ہے۔ ساری جڑیں، جو دھرتی کے سینے میں دھنسی رہتی تھیں، باہر باہر ننگی دکھائی دے رہی ہیں۔ کتنے دن ہو گئے، ہم نے ان جڑوں پر مٹی نہیں ڈالی، ان کے تنوں کو ڈھکنے کا کام نہیں کیا۔ ماتا کو چھاؤں دینے والے ان پیڑوں کی حالت ہم نے کیسی بنا رکھی ہے! بولو، چپ کیوں ہو؟ ایسے میں ماتا ہم سے ناراض نہیں ہوں گی تو کیا ہوں گی؟'

جامن مہتو کی بات سن کر بھیڑ میں سب کی نگاہیں پیڑوں کی طرف مڑ گئی ہیں۔ ہلکی ہواؤں کے باوجود پتیوں میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ ڈالیاں، جو کب سے جھکی تھیں، اب بھی جھکی ہیں۔ مگر ان میں بھی جیسے کوئی حرکت نہیں رہ گئی ہے۔

ٹال واسیوں کو اچانک نیم، پیپل اور بڑ کے پیڑ سمٹ سمٹ کر چھوٹے ہوتے محسوس ہوئے۔ ڈالیاں چھوٹی ہوتی ہوتی تنے کا حصہ بنتی دکھائی دیں۔ پیڑوں کی اونچائی، ان کا دائرہ ایکدم سے سکڑتا نظر آیا۔ ٹال واسیوں کے منہ سے ایک ساتھ لمبی چیخ نکلی۔

'ماتا! ہماری حفاظت کرو۔ ہماری غلطیوں کو معاف کرو۔ ہم نے برسوں برس ان پیڑوں کی جڑوں کو مٹی نہیں دی۔ ان کے تنوں کو ہم نے ڈھکا نہیں۔ ہم نے پاپ کیا، ماتا! ہمیں معافی دو۔ ہم سب تمہاری سنتان ہیں، ماتا! ہماری حفاظت کرو۔'

جامن مہتو کی آواز رندھ گئی ہے۔

یکا یک، شردھالوؤں کی بھیڑ نے دیکھا، جامن مہتو پیپل کے پیڑ کی جڑوں پر پسر گئے ہیں۔

اپنے دونوں ہاتھوں سے انہوں نے جڑوں سے باہر جھانکنے والے ریشوں کو ڈھک لیا ہے۔

دیکھتے دیکھتے شردھالوؤں کی پوری جماعت ماتا کی پیڑی سے اٹھ کر پیڑوں کے ارد گرد جمع ہو گئی ہے۔ سب کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ سب کے آنسو سوکھی جڑوں کو سینچ رہے ہیں!

پرانی عمر کے ٹال واسی یاد دلاتے ہیں، ایک بار پہلے بھی، چالیس سال پیچھے، ٹال پر ایسی ہی پریشانی آئی تھی۔ دو سمتوں سے آنے والی دھنائن اور بگدادی ندیاں ماتا کی ناراضگی کے سبب بالکل سوکھی رہ گئی تھیں۔ تیسری، ان میں سب سے بڑی ندی، ہروہر بھی اپنا راستہ بھول گئی تھی۔ سہ رخی راستے میں پانی کے تینوں سوتے مر گئے تھے۔

پورے ٹال کی دھرتی میں درار پڑ گئی تھی۔

ٹال میں ویسا اکال پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔

ٹال کے گاؤں پانا پور کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ اتر میں ہروہر اور پچھم میں سمائے ندی سونی پڑ گئی تھی۔ زمینداروں کی کچہری بھی پوری طرح سنسان تھی۔

اتر میں ہروہر اور پچھم دشا میں ٹاٹی ندی سے گھرے کوسوہا کے تینوں ٹولے، جور پار، ڈیہہ پر، اور گھاٹ کوسوہا پانی سے خالی ہو گئے تھے۔ ندی کی پوری لمبائی کے دونوں طرف بسے پچیسوں گاؤں کے مزدور کسان ٹال کی ویران دھرتی دیکھ دیکھ دھاڑیں مارنے لگے تھے۔ پچھم میں برونی، گگور، اور کوئلا گاؤں، اتر میں گدودیا، سرورا اور پالی، پورب میں مربریا، فادل اور آنجنی گاؤں پوری طرح ویران تھے۔

تب، ٹال واسیوں کو یاد ہے، ٹال کی تین چوتھائی آبادی بھوک مری سے بچنے کے لئے پنجاب اور گجرات کی منڈی کی طرف کوچ کر گئی تھی۔

اس وقت بھی ٹال واسیوں نے اسے جے منگلی ماتا کی ناراضگی بتایا تھا۔ اور سارے گاؤں نے عہد

کر کے پیڑوں کے تنے پر منوں مٹی ڈالی تھی۔ پھر خود پیاسے رہ کر، میلوں میلوں دور سے لائے گئے پانی سے پیڑوں کو ہرا بھرا رکھنے کی کوشش کی تھی۔ تب ان کی کوششیں ماتا کے آشیرواد سے ہری بھری ہوئی تھیں۔ پیڑوں پر پتیاں لوٹ آئی تھیں۔ سوکھی ندیوں میں راتوں رات پانی کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔

ٹال واسیوں کو حیرت تھی کہ پانی کا موسم گزر جانے پر بھی ندیوں میں یہ اچھال کس کی کرپا سے ممکن ہوا ہے۔ تب بغیر کسی بحث کے تمام ٹال واسیوں نے جئے منگلی ماتا کی پیڑی پر ہفتوں ہفتوں پوجا کی تھی، چڑھاوا دیا تھا۔ انہیں یاد ہے، چڑھاوا دے کر لوٹتے وقت وہ موسلا دھار بارش میں بھیگ بھیگ گئے تھے۔

لیکن آج، اتنے برسوں بعد، ٹال کی دھرتی دوبارہ سوکھی پڑی ہے۔ تمام سمتوں سے آنے والی ندیوں نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ ٹال کے کھیت، جہاں بارہ پندرہ فٹ پانی اچھالیں مارتا رہتا تھا، آج پانی کے لمس کو بھی ترس رہے ہیں۔ ٹال میں جنگلی گھاس بے طرح اُگ آئی ہے۔ ان میں کیڑے لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ مال مویشی بھی اس جنگلی گھاس سے پرہیز کرتے ہیں۔

جہاں تین تین چار چار مہینے پانی کا سامراج ہوتا تھا اور ٹال کے گاؤں ٹاپوؤں کی طرح نظر آتے تھے، وہاں اب ڈیہہ ہوں یا ٹیلے، اجڑی بستیوں کا منظر دکھاتے ہیں۔ گاؤں گھر کی چھوٹی چھوٹی بچیاں جنگلی گھاس کاٹ کر مٹھی بھر کمائی کو مجبور ہیں۔ شادی بیاہ کا موسم آ کر گزر جائے گا۔ جانے کتنوں کے ہاتھ اس برس بھی پیلے ہونے سے رہ جائیں گے!

کہتے ہیں، ایک بار گنگا میا اپنے دونوں بازو بسے گاؤں والوں کی بداعمالیوں سے تنگ آ کر روٹھ گئی تھیں، تو ان کی گود سے نکلنے والی ساری کی ساری چھوٹی بڑی ندیوں کے پانی پر قہر چھا گیا تھا۔

ساری دھارائیں سوکھ گئی تھیں۔ تب ان دھاراؤں کو 'مرگنگا' کہا گیا تھا۔

پرانے لوگ یاد کرتے ہیں کہ اس پریشانی کے عالم میں جئے منگلی ماتا نے ہی گنگا میا کو سندیش بھیج کر گاؤں والوں کی جانب سے معافی مانگ لی تھی اور گنگا تک پہنچنے والی سبھی دھارائیں دوبارہ زندہ ہو اٹھی تھیں۔

ٹال واسی کچھ انہی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک جامن مہتو نے گمچھے سے اپنے آنسو پوچھتے ہوئے راموڈھاڑھی کو آواز دی —

'جئے منگلی ماتا نے ہمیں معاف کر دیا ہے، رامو، دیکھ پیڑ کی ڈالیاں دوبارہ اپنے تنے تک پھیل گئی ہیں، اور دیکھ پتیوں میں بھی حرکت آ گئی ہے۔ اور ہاں، دیکھ آسمان میں جدھر تدھر بادل بھی نظر آ رہے ہیں۔ اس بار ٹال چھوڑ کر کوئی باہر نہیں جائے گا، رامو۔ ماتا مان گئی ہیں۔ ہم سب یہیں رہیں گے۔ ماتا کی کرپا سے بادل برسیں گے، دھرتی کو ضرورت بھر پانی مل جائے گا۔ ہم اپنے بیج اس کی گود میں ضرور ڈال دیں گے، رامو۔ دیکھ، کہہ دے، سارے گاؤں کو کہہ دے، کوئی باہری منڈیوں میں نہیں جائے گا۔ بادل برسیں گے، رامو۔ دیکھ، دیکھ ماتا کی پیڑی پر بھی پھوہاریں گر رہی ہیں۔

ٹال واسیوں نے حیرت بھری آنکھوں سے جامن مہتو کی طرف دیکھا۔

بولتے بولتے، جامن مہتو اچانک رک گئے۔

پیپل کے تنے کو دیر سے پکڑے ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

میلوں دور، مرگنگا کی اوپری سطحوں پر ہری دُوب اُگ آئی ہے!

مندر سے لوٹتے وقت، میں رہ رہ کر سوچتا ہوں، ریت سے اپنا کئی کئی جنموں کا رشتہ ہے۔ اپنے پرکھے پھلگو ندی کی ریت پر جنمے تھے۔ اپنا جنم بھی پھلگو ندی کے ریتیلے آنگن میں ہوا تھا۔ اس پھلگو ندی کے آنگن میں، جسے ہندی اردو کے شبدکوش 'سار ہین' بتاتے رہے، مگر جو ایک تہہ آب رواں پھل دینے والی عظیم ندی ہے۔

مجھے یہ ندی اور اس کی سفید چادر پر پھیلی ریت ایسا سکھ دیتی ہے، جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ نویس کہتے ہیں، اس ندی کا اپنا کوئی منبع نہیں۔ اس کا وجود دو دیگر ندیوں پر ٹکا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں، دو دیگر ندیوں سے بہہ کر آنے والا پانی پھلگو کی گود میں آ کر ریت کی تہوں میں اس طرح خاموش کیوں بیٹھ جاتا ہے۔ اسے ندی کی اوپری سطحوں کا دلکش منظر کیوں نہیں راس آتا!

میرے لئے پھلگو کی ریتیلی گود میری ماں کے دودھیا آنچل کی طرح ہے۔ جیسے پھلگو اپنے دکھ درد کسی کو نہیں بتاتی، ریت کے ان ذرّوں کو بھی نہیں، جو خود اس کے وجود کا حصہ ہیں، ویسے ہی میری ماں نے بھی اپنے دکھ درد کسی کو نہیں بتائے۔

ساری زندگی وہ بھی اپنے دکھوں پر دبیز چادر ڈالتی رہی۔

کالے جسموں کی آگ

ساتویں منزل کی زندگی نہ تو اچھی ہوتی ہے، نہ بری۔

اچھی اس لئے نہیں ہوتی کہ یہاں رہ کر آپ جگمگ ستاروں والے آسمان کو نہیں دیکھ پاتے۔ نہ ہی آپ کی نظریں اس جانی پہچانی زمین تک پہنچتی ہے، جہاں ہری ہری گھاس اُگی ہوتی ہے اور پیڑ پودے ماحول کو کئی کئی رنگوں سے سجا کر رکھتے ہیں۔

لیکن ساتویں منزل کی زندگی بری بھی نہیں ہوتی۔ بری اس لئے نہیں ہوتی کہ یہاں سے نظریں نیچے جھکا کر دیکھنے پر لوگ اپنے اصلی قد میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے، بونے بونے! اپنے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھنا چاہیں، تو بھی ان کا اصلی قد انہیں کیڑے مکوڑے کی جماعت سے اوپر اٹھنے نہیں دیتا۔ وہ بس اپنی اس بونی دنیا، بونے سنسار میں اچھل کود کرتے رہتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ کچھ آنکھیں ساتویں منزل سے لگاتار انہیں دیکھ رہی ہیں۔

میں اس وقت جس ساتویں منزل پر ہوں، اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں سے نیچے دیکھنے پر مجھے کیڑے مکوڑوں کا قد بھی اپنے قد سے کچھ اونچا ہی نظر آتا ہے۔

ساتویں منزل کی دیواروں پر، بڑے سائز کے آئینے لگے ہیں۔ جن میں آپ آسانی سے اپنے آپ

کو، سر سے پیر تک، دیکھ سکتے ہیں۔ سچ مچ، اگر آپ کا قد کچھ 'شان' بڑھانے والا ہوتا تو آپ کی پیشانی، یا سر کے بال، آئینے کے اوپری حصے کو چھو رہے ہوتے۔ لیکن آپ تو آئینے کے فریم کے نچلے حصے سے بس کچھ ہی اوپر نظر آرہے ہیں۔ پھر آپ کا قد، سات منزل نیچے، زمین پر رینگنے والے، کیڑے مکوڑوں کے قد سے اونچا کیسے!

ساتویں منزل پر رہتے، میں نے شاید ہی کبھی سوچا ہو کہ کبھی کبھی، زمین پر رینگنے والے، بونے قد کے جانور، تفریح کے لئے، نظریں اٹھا کر اوپر دیکھنے پر کیا سوچتے ہوں گے۔ پہلی منزل سے ساتویں منزل تک اٹھتی ان کی آنکھیں سپاٹ دیواروں، بند کھڑکیوں کے شیشوں اور موٹے پتلے پائپ کی قطاروں کے بیچ، کوئی زندہ چہرہ ضرور تلاشتی ہوں گی۔

کہیں، کسی ادھ کھلے دروازے یا کھڑکی، یا پھر چھوٹی سی بالکونی کے کسی کونے پر، کوئی چہرہ نظر آ بھی جائے تو اس کے زندہ ہونے میں شک ہوتا ہے، ان کیڑے مکوڑوں کو۔ دراصل، اتنے فاصلے سے، وہ ساتویں منزل پر رہنے والوں کے چہرے دیکھ کر ان پر چھائی خوشی یا غم کی لکیروں کا فرق نہیں سمجھ پاتے۔ سچ پوچھیں، تو وہ ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے دل کے کسی کونے میں وہ یہ حسرت بھی نہیں پال سکتے کہ کوئی، ایک دن، انہیں بھی سہارا دے کر ساتویں منزل کی اونچائیوں تک پہنچا دے۔ تا کہ وہ اس ساتویں منزل کے سچے طلسم کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

اسی ساتویں منزل کی ایک، گھنے اندھیرے والی رات، میں نے دیواروں پر، صلیب کی طرح ٹنگے آئینے سے نظریں چرا کر نیچے، پہلی منزل سے بھی نیچے، اوبڑ کھابڑ زمین کی طرف دیکھا۔ مجھے کالے جسموں کا ایک خوفناک ہجوم، غول بنا کر، ایک تیز جلنے والی آگ کے چاروں طرف بیٹھا دکھائی دیا۔ کالے جسموں سے چنگاریاں پھوٹتی، ان کی آنکھوں سے شعلے برستے، مجھے صاف نظر آرہے ہیں۔

کالے جسم، جو اس وقت کیڑے مکوڑے نہیں لگ رہے ہیں، اور جن کا قد ساتویں منزل پر رہنے والے کسی بھی آدمی کے قد سے اونچا لگ رہا ہے۔

میرے لئے ساتویں منزل کی کھڑکیاں موت کے دروازے بن گئی ہیں۔

میں نے ایک جھٹکے میں کھڑکیاں بند کر دی ہیں۔

اندھیرے میں اچانک ہی میرا بونا، کیڑے مکوڑوں جیسا بدن اس دیوار سے ٹکرا گیا ہے، جہاں بڑے قد کا ایک آئینہ ٹنگا ہے۔

آئینہ میرے بدن سے ٹکرا کر ایک لمحے کو ہلا، پھر ساتویں منزل کے چمکدار فرش پر گر کر چور ہو گیا ہے!

ساتویں منزل کی راہداریوں میں سناٹا ہے!
نیچے، کالے جسموں کی آگ اور بھڑک اٹھی ہے!

ڈمپنگ گراؤنڈ

وہ ایک غیر معمولی منچ تھا، کئی معنی میں غیر معمولی!

پردہ ہٹا، تو منچ پر تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

مکمل تاریکی! ایسی تاریکی آپ نے کم دیکھی ہوگی۔

مجھے یاد ہے، پردے کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ مکمل سیاہ!

بیک گراؤنڈ سے آنے والی آواز کا رنگ بھی سیاہ ہوتا، تو یقین کرنا مشکل تھا کہ پردہ دراصل ہٹا بھی ہے، یا نہیں۔ لیکن، آپ تو جانتے ہیں، آواز، تیز ہو یا دھیمی، طربیہ ہو یا دل سوز، اس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ اس لئے بیک گراؤنڈ سے آواز اُبھری، تو درشکوں نے مان لیا کہ پردہ اُٹھ گیا ہے، اور ان کی نظریں منچ پر ٹک گئیں۔

لیکن یہ کیا، منچ تو پورا تاریکی میں ڈوبا تھا!

یکایک، پردے کی اوٹ سے، اوپر کی سمت جاتی، درشکوں کو روشنی کی ایک باریک لکیر دکھائی دی۔ لکیر منچ کی پشت کے اوپری کنارے تک تیزی سے گئی، پھر نیچے کی طرف سرکتی نظر آئی۔ تب تک، منچ پر، اس لہر جیسی لکیر کے سوا اور کچھ نہیں تھا، کچھ بھی نہیں۔

لکیر، درشکوں نے دیکھا، نیچے کی طرف سرکتی رہی۔ مجھے یاد ہے کہ نیچے کی طرف سرکتے وقت اس

کی رفتار، پہلے کے مقابلے، کم تھی۔ منچ کی پشت کے نچلے کنارے کو چھوتی ہوئی روشنی کی یہ باریک لکیر کچھ لمحوں کے لئے تھم سی گئی تھی۔ درشکوں نے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا، روشنی کی اس باریک لکیر کی گہرائی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ بالکل پہلے جیسی ہی تھی یہ لکیر، جیسے کہ وہ منچ کے ایک کنارے سے اندھیرے کو چیرتی اُبھر رہی ہو۔

درشکوں نے اپنی سانسیں روک رکھی تھیں۔ جیسے ان کے سروں پر سکوت کا شامیانہ تن گیا ہو، اور اس کی طنابیں کچھ گمنام ہاتھوں نے تھام رکھی ہوں۔

کھچاکھچ بھرے ہال کی چھت سے، نیچے کی طرف گرنے والی روشنی کی بوندیں، کبھی کبھی، انہیں ہلکی ٹھنڈک کا احساس دلا جاتی تھیں۔

لیکن یہ بوندیں، روشنی کی، ان کے سکوت کو توڑنے میں کامیاب نہیں تھیں۔

تبھی، یکا یک، روشنی کی یہ لکیر درشکوں کی سمت، آگے کی طرف، بڑھتی دکھائی دینے لگی۔ درشک جیسے گھبرا اٹھے ہوں۔ روشنی کی یہ باریک لکیر انہیں نیزے کی طرح اپنی جانب آتی محسوس ہوئی۔ ہال کی چھت سے ٹپکنے والی روشنی کی بوندیں تھم گئی تھیں۔ درشک اپنی سانسیں روکے، تیزی سے آگے بڑھتی روشنی کی لکیر سے خوفزدہ ہو رہے تھے۔ پھر، اُن نے دیکھا، روشنی کی لکیر، منچ کے مرکز میں، بالکل مرکز میں، آ کر ٹھہر گئی۔ درشکوں نے راحت کی سانس لی۔ پہلی بار، پردہ اٹھنے سے لے کر اب تک، پہلی بار، انہیں سکون کا احساس ہوا، اور اندھیرے کے باوجود، ان کی آنکھوں نے، منچ کے بالکل مرکز میں، اس دائرے کو دیکھا، جو روشنی کی باریک لکیر کے پھیلنے سے اُبھر رہا تھا۔

روشنی کا ایک بے خوف دائرہ، جس نے منچ پر اندھیرے کے جزیرہ نما وجود کو پوری طرح ڈھک لیا تھا!

بیک گراؤنڈ سے آنے والی آواز، جس کا رنگ بالکل سیاہ نہیں تھا، اور جو درشکوں کے کانوں تک آسانی سے پہنچ رہی تھی، طویل وقفہ پر دوبارہ سنائی دینے لگی۔

'یہ جو روشنی کا گھیرا ہے، یا پھر آپ اسے دائرہ کہہ لیں، اس نے منچ کے مرکزی حصے میں ہماری، آپ کی زندگی کے ویران اندھیرے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس اندھیرے میں ہمارے وجود کی ناکامیاں قید ہیں، اور ہماری خوشیاں بھی۔ اس اندھیرے نے چہار طرف، ہر سمت، اپنے جال پھیلا رکھے ہیں۔ روشنی کی یہ باریک لکیر، جو پردہ ہٹنے کے بعد، منچ کے ایک کنارے سے اُبھری تھی، اور جو منچ کی پشت پر اوپر تک پھیل گئی تھی، اس نے اب ایک دائرے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دائرہ، جس کی گود میں ہماری ناکامی، ہماری نفرت، ہماری خودغرضیاں چھپی ہیں۔ خودغرضیاں، جو ہمارے اُجاڑ بھرے اندھیرے، ہماری زندگی کے سناٹے کی ایک گمنام پہچان بن گئی ہیں۔'

بیک گراؤنڈ سے آنے والی آواز جاری ہی تھی کہ یکا یک منچ پر روشنی کا ایک دھماکہ سا ہوا۔ روشنی کی وہ باریک لکیر، جس نے ابھی ابھی، درشکوں کی نظروں کے سامنے، ایک دائرے کی شکل لے لی تھی، اور جس کی گود میں ہمارے وجود کی ناکامیاں اور ہماری نفرتیں چھپی تھیں، منچ کے مرکزی نقطے سے اچانک غائب ہو گئیں۔ روشنی کا بڑا دھماکہ اس دائرے کو جیسے نگل گیا ہو!

درشک حیرت زدہ تھے، لیکن بے صبر نہیں۔ ان کی تجربہ کار آنکھوں نے، منچ پر، خوف اور تشدد کے مختلف مناظر دیکھے تھے۔ آندھی طوفان، برف باری، قتل و غارت گری، موت کے کئی کئی منظر، ان کی آنکھوں سے بارہا گزرے تھے۔ لیکن آج سے پہلے، انہوں نے کبھی ایسا کچھ محسوس نہیں کیا تھا، جیسا اس ہال کے سناٹے میں وہ آج کر رہے تھے۔ ہر لمحہ ایک نامعلوم اندیشے کی طرح ان کے

ذہن کے پردے پر اُبھر اور ڈوب رہا تھا۔

تیز روشنی کے دھماکے سے چندھیائی ان کی آنکھیں نارمل ہوئیں، تو انہیں منچ کے مرکز میں ایک خوفناک کھائی نظر آئی۔

سیاہ اور خوفناک کھائی، جس کے دہانوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

ہال میں چھوٹے بچے نہیں تھے۔ بالکل نہیں تھے۔ بچیاں بھی نہیں تھیں۔ بالکل نہیں تھیں۔ عورتیں تھیں ضرور۔ تو کیا حیرت اور خوف میں ڈوبی یہ سسکتی آوازیں ان عورتوں ہی کی تھیں!

نہیں، تو پھر ہال میں حیرت اور المنا کی کی یہ ترنگیں کہاں سے اُٹھ رہی تھیں!

بیک گراونڈ روشنی کے دھماکے میں ڈوب گیا ہو، جیسے۔ کہیں کوئی حرکت نہیں تھی۔ درشکوں کی تیز تیز سانسوں کے سوا۔ اور ہاں، اگر انہیں عورتوں کی سسکیاں مان لیں تو، ان کے سوا ہال میں نہ کوئی آواز تھی نہ حرکت۔ خاموشی میں ڈوبے چہرے ضرور تھے، ہال میں۔

اپنی اپنی کرسیوں سے چپکے، اُداس چہرے، جن کے جسم ان کے چہروں سے الگ ہو گئے تھے!

تبھی منچ پر روشنی کا ایک اور دھماکہ ہوا۔ پہلے سے بھی تیز رفتار سے منچ پر پھیلنے والا ایک دھماکہ! درشکوں کی آنکھیں منچ پر بکھرتی روشنی کی کرنوں سے بندھ گئیں۔ منچ کی سطح پر، اچانک، اِس کنارے سے اُس کنارے، سینکڑوں چہرے دکھائی دینے لگے۔ چہرے، جواب اپنے جسموں کے ساتھ، بیک گراؤنڈ سے اُبھرنے والی کسی دلکش موسیقی کی دُھن پر تھرک رہے تھے!

منچ کے مرکز میں، تھوڑی دیر پہلے چنگاریاں اُگلنے والی جو بھیانک کھائی درشکوں کو دکھائی دے رہی

تھی، وہ اب برابر زمین بن گئی تھی۔

ہال کا وسیع و کشادہ منچ گلاب کی پنکھڑیوں سے پٹ گیا تھا!

درشکوں نے دیکھا، پردہ گر رہا ہے۔ اور بیک گراؤنڈ سے ایک جانی پہچانی آواز ابھر رہی ہے۔

'ابھی ابھی، آپ نے، منچ پر، جو کچھ دیکھا، ہم نے اسے 'ڈمپنگ گراؤنڈ' کا نام دیا ہے!'

کھیل شاید ختم ہو چکا ہے

اس نے فاتحانہ انداز میں میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا، جو ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔
پھر اس نے میرے پیروں پر نظر ڈالی۔ وہ بیڑیوں میں تھے۔

ایک بار اس نے میرے ہونٹ ٹٹولے، شاید صرف یہ دیکھنے کو کہ ان میں کوئی حرکت یا جنبش بچی ہے یا نہیں۔

پھر اس نے اچھی طرح میری آنکھوں میں جھانکا۔

مجھے لگا، شاید پرکھنے کے لئے کہ ان میں اب بھی کوئی سپنا تو نہیں پل رہا۔

ایک گھومتی ہوئی نظر اس نے میری گردن، اور شاید میری ریڑھ کی ہڈی پر بھی ڈالی۔

وہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ میری گردن کتنے زاویے تک اٹھی یا جھکی ہوئی ہے۔

یا پھر میری ریڑھ کی ہڈی کیا اب بھی پہلے کی طرح تنی ہوئی ہے۔

اس نے میرے کانوں کو بخش دیا۔

یہ جاننے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ ان کے پردے سہی سلامت ہیں یا نہیں۔

مکمل جانچ پرکھ سے شاید وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

'تبھی اس نے اپنے کارندوں سے کہا: پہلے ہتھکڑیاں، پھر بیڑیاں کھول دی جائیں۔'

اس کی آنکھوں کے اشارے پر چلنے والے کارندوں نے ہتھکڑیوں میں چابی ڈالی، اور میرے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے الگ، آزاد کر دیا۔

برسوں بعد، میں نے اپنے ہاتھ نیچے اوپر ہلائے، اپنی ہتھیلیاں جوڑیں، اور اپنی انگلیوں کو ایک ساتھ پھنسا کر دیکھنا چاہا کہ ان میں قلم پکڑنے کی طاقت بچی ہے یا نہیں۔

پھر اس کے کارندوں نے لوہے کی گرم سلاخوں سے میری بیڑیاں کاٹیں۔

میں نے دیکھا، بیڑیاں کاٹتے وقت، سلاخوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

ہر بار، جب سلاخوں سے تیز چنگاریاں نکلتیں، وہ چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا۔

مجھے یاد ہے، ایک بار تو اس نے اپنے کارندوں کو شک کی نگاہ سے بھی دیکھا۔

'اتنی چنگاریاں کہاں سے نکل رہی ہیں؟ انہیں پھیلنے سے روکو۔'

غریب کارندہ، حکم کا غلام، کچھ لمحہ سہم گیا تھا۔

میں نے خود محسوس کیا، اس کے ہاتھ کانپے تھے۔ پر وہ ضرور ہی سنبھل گیا تھا۔

میری بیڑیاں کاٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

اس بیچ وہ خود وہاں موجود رہا، اپنے صلاح کاروں کے ساتھ۔

ہتھکڑیاں کھل گئیں، بیڑیاں کٹ گئیں، تو میں دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ میرے پیر ذرا دیر کے لئے لڑکھڑائے۔ میری رگوں میں، برسوں سے، جو خون کے قطرے آہستہ آہستہ سرک رہے تھے،

یکبارگی دباؤ میں آ کر اُبلے۔ مجھے اپنی رگیں پھٹتی محسوس ہوئیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے گھبرا گیا۔ اندھیرے کا ایک ہلکا بادل کچھ پل کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اُبھرا۔لیکن میں شاید سنبھال سکا تھا اپنے کو۔

تبھی مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

'تمہارے ہاتھ پیر آزاد ہیں اب۔تم چل سکتے ہو،اپنے ہاتھوں سے اپنے کام نپٹا سکتے ہو۔لیکن تم اس چہاردیواری سے باہر نہیں جا سکتے۔میرے کارندے تم پر نظر رکھیں گے۔دوسرے قیدیوں سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہوگا'

پھر اس نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔

ان میں سے ایک نے میری آنکھوں پر کالی پٹی چڑھا دی۔

اب میں پوری طرح اندھیرے کی گرفت میں تھا۔

کوئی میرا ہاتھ تھامے مجھے اپنے ساتھ لئے چل رہا تھا۔

ایک لمبی دوری طے کرنے کے بعد میری آنکھوں پر لگی کالی پٹی کھول دی گئی۔

میں نے دیکھا، یہ نئی جگہ پہلے سے زیادہ کھلی، کشادہ اور ہوادار تھی۔

یہاں روشنی آنے کے کئی راستے تھے۔اسے روکنے والی دیواریں نہیں تھیں یہاں۔بالکل نہیں تھیں۔

میرے آنے سے پہلے ہی وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔

میری آنکھوں کی کالی پٹی کھولی گئی تو سامنے مجھے اس کا ہی چہرہ سب سے پہلے دکھائی دیا۔

'یہ جگہ تمہیں پسند آئے گی۔ تم یہاں آرام سے رہ سکوگے، جب تک ہماری ہدایتوں پر چلتے رہوگے۔ میری ہدایتیں زیادہ سخت نہیں ہوں گی۔ تمہیں بس اپنے ہونٹ سلے رکھنے ہوں گے۔ تم کسی سے بات چیت نہیں کروگے۔ ہم چاہتے ہیں، بھول جاؤ کہ تم کبھی اپنے چاہنے والوں کے سامنے، بے خوف اپنے جذبات بیان کرتے تھے۔ تمہارے جذبات مجھے مجروح کرتے رہے ہیں۔ میری سلطنت کو ان جذبات سے خطرہ ہے۔ اس لئے، تم اپنی زبان بند رکھوگے، ہمیشہ کے لئے، سدا۔'

اتنا کہہ کر وہ اپنے صلاح کاروں کے ساتھ اس نئی جگہ سے چلا گیا۔

اس کے چلے جانے پر، میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ سچ مچ، یہ جگہ اچھی تھی۔ پہلے والی جگہ سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ جگہ جگہ، پھول پتیاں تھیں، صاف شفاف پانی کے سنگ مرمری فوارے تھے۔ سڑکوں کے اردگرد، ہری ہری گدے دار گھاس کی قالینیں بچھی تھیں۔ اونچے نیچے میناروں سے بکھرتی روشنی کا طلسم تھا۔ جگہ جگہ، خوبصورت چہروں کے جھرمٹ تھے۔ چہروں پر بے باک مسکراہٹوں کا جادو تھا۔

نئی جگہ، سچ مچ، نئی تھی۔ بالکل نئی۔ دلوں کو اپنی مٹھی میں باندھ لینے والی جگہ!

ایک نئی دنیا تھی، میرے لئے، یہ جگہ۔ خوشی خوشی رہ سکتا ہوں میں اس جگہ۔

جب تک میں اس کی ہدایتوں پر دل و جان سے عمل کرتا رہوں۔

میرے لئے اس نے بس ایک چھوٹی سی شرط لگائی ہے، بس ایک مختصر سی شرط۔

مجھے اپنے ہونٹ سلے رکھنے ہیں۔ اپنی زبان بند رکھنی ہے۔

یہ نئی جگہ، دراصل ایک رنگ منچ ہے۔ میں اس رنگ منچ کا ایک اہم کردار ہوں۔ شاید اس رنگ منچ کا سب سے پرانا کردار۔ مجھے یاد نہیں، (میرے تجربوں نے شاید میری یادداشت پر اثر ڈالا ہو) میں نے کتنی صدیاں اس رنگ منچ پر اسی طرح گزاری ہیں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، آنکھوں پر سیاہ پٹی، سلے ہوئے ہونٹ، بند زبان!

رنگ منچ کا پردہ، ابھی ابھی، اُٹھا ہے۔ کھیل جہاں ختم ہوتا ہے، وہیں سے شروع ہوا ہے۔

میں نے اپنی آزاد مٹھیاں بھینچی ہیں، ہوا میں لہرائی ہیں۔

میرے پیروں کی جھنکار سے منچ کی سطح پر ایک لرزہ سا محسوس ہوا ہے۔

میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی کو کسی زندہ درخت کے مضبوط تنے کی طرح سیدھا کیا ہے۔

اور اپنی گردن آسمان کی سمت اٹھا کر اپنے ہونٹوں کو حرکت دی ہے۔

اب میری آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ نہیں ہے۔

اس کے صلاح کاروں، کارندوں کے چہرے بھی نہیں ہیں اب، میرے سامنے۔

منچ پر تیز روشنی پھیل گئی ہے۔

سامنے، ہزاروں ہزار کی تعداد میں، تمام عمر کے لوگ، بے تابی سے تالیاں بجا رہے ہیں۔
کھیل شاید ختم ہو چکا ہے!

انگارے اور ہتھیلیاں

ہزار برس پرانے صندوق کی بیڑیاں کھلیں تو، تہہ در تہہ، حفاظت سے رکھی دستاویز میں درج ایک خوبصورت عبارت دیکھنے کو ملی۔

عبارت کی زبان اور رسم الخط، دونوں سے اجنبی پن کی بو نکلتی محسوس ہوئی۔ اس بو نے عبارت کو سمجھنے اور اس کے معنی تک پہنچنے کا راستہ آسان کر دیا۔ عبارت کی زبان بالکل سادہ اور سپاٹ نظر آئی۔

اپنے پرکھوں نے آئندہ نسلوں کے لئے آسانی سے سمجھ میں آنے والی ایک نصیحت درج کر دی تھی، اس اجنبی عبارت میں۔

نصیحت میں کہا گیا تھا —

'کیا تم نے تاریخ کا وہ باب نہیں پڑھا، جہاں ہماری قربانیوں، ہماری تکلیفوں کی ہمیشہ زندہ رہنے والی مثالیں درج ہیں؟

کیا تم نے ان مثالوں سے نہیں سیکھا کہ ہم اور ہمارے پرکھے آگ کی راہداریوں سے کس طرح ہنستے مسکراتے گزرتے رہے ہیں؟

کس طرح آگ کی پٹیاں اور انگاروں کی سیج ہمارا مقدر بنی رہی ہیں، کیا تم نے نہیں جانا!

کیا تم انجان ہو اس حقیقت سے کہ تمہارے پرکھوں کی پشت پر زہریلے نیزوں کی کنی سے حملے

ہوئے، اوران کے سران کے دھڑوں سے الگ کردیئے گئے؟

کیاتم نے نہیں جانا کہ تمہارے مورث صرف اس لئے گمنام جگہوں پر دفن کئے گئے کہ ان کے دشمن قبر سے ان کی لاشیں نکال کران کی بے حرمتی نہیں کریں!

کیاتم نے ان میں سے ایک بات بھی نہیں جانی!

کیاتم تمام زندگی سچ مچ ان باتوں سے غافل رہے!

اگر یہ سچ ہے کہ تم تاریخ کی ان اہم سچائیوں سے سچ مچ انجان رہے، تو ہمارے دل میں تمہارے لئے ہمدردی کا جذبہ ہے۔

لیکن جان لو کہ قدرت نے تمہیں بھی، ہماری ہی طرح، یہ ذمہ داری سونپ دی ہے کہ تم بھی، ہماری طرح، اپنی آنے والی نسلوں کو بتا سکو کہ ہم اور ہمارے مورث کس طرح اپنی ہتھیلیوں پر انگارے لئے آگ کی راہداریوں سے گزرتے رہے ہیں۔

لیکن اپنی نسلوں کو یہ سب بتانے کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ تم خود بھی آگ کی راہداری پر چلنے کی مشق کرو، اوراپنی ہتھیلیوں پر انگاروں کے دستے سنبھالے آگے بڑھو'

ہزار برس پرانے صندوق کی بیڑیاں کھلیں تو، تہہ در تہہ، حفاظت سے رکھی دستاویز کی یہ خوبصورت عبارت ہماری آنکھوں کے پردے پر آسمان میں کھلے تاروں کی طرح ابھر آئی۔

ہم نے اپنے لہو رنگ وجود کی گہرائیوں میں زندگی کی چند روشن تصویریں ابھرتی محسوس کیں۔

ہزار برس پرانے صندوق کی بیڑیاں کھلیں تو بس کھلی ہی رہیں۔ انہیں دوبارہ، آنے والی کسی صدی میں، خود اپنی نسلوں کے لئے محفوظ کر دینے کا جذبہ، پتہ نہیں کیوں، مجھے اپنے اندر محسوس نہیں ہوا۔

میں نے ہزار برس پرانے صندوق کی بیڑیاں کھول دیں، اور صندوق میں، تہہ در تہہ، حفاظت سے رکھی دستاویز میں درج، اس خوبصورت عبارت کو، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، آزاد کر دیا۔

آزاد، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد!

پیلی عبارت

میں نے اپنی کمزور پڑتی آنکھوں سے کاغذ کے اس چوکور ٹکڑے کو غور سے دیکھا۔ کاغذ تو سفید ہی لگتا ہے۔ لیکن اس پر درج پیلی عبارت نے اسے رنگین بنا دیا ہے۔ رنگ بھی صرف پیلا ہے، لفظوں سے لے کر حاشیے تک۔ محرر نے ضرور اپنا نام لکھنے کے لئے کسی دوسرے رنگ کا استعمال کیا ہے۔ لیکن عبارت کے گہرے پیلے پن نے شاید اسے کاغذ پر زیادہ ابھرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

میں نے لفظوں کے پیلے پن کی اندرونی تہوں کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ الفاظ شفاف ہیں، اس لئے پڑھنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی، حالانکہ آنکھیں میری کمزور پڑتی جا رہی ہیں، اور چشمے کا پاور تیزی سے اوپر جا رہا ہے۔ سفید کاغذ پر درج پیلی عبارت کئی کئی عکس ابھارتی محسوس ہو رہی ہے۔ کہیں خاموش، تو کہیں بولنے والے عکس!

وہ انتقام کے علامتی عکس نہیں ہیں۔ ان میں ناراضگی کی صدائیں بھی نہیں ہیں۔ ان میں چھپی ہے ایک سنگین عیاری، اور ایک بے رحم احسان فراموشی، جو لفظوں کے لئے ایک زہر آلود پیراہن گڑھ لیتی ہے۔ احسان فراموشی کا یہ زہریلا ذائقہ میرے لئے نیا نہیں ہے۔ میں لفظوں کے اس تیزابی ذائقے سے پہلے بھی کئی کئی بار گزر چکا ہوں۔ مجھے لفظوں کا زہریلا پن کسی صورت اجنبی نہیں لگتا۔

میں نے اوپر کہا، سفید کاغذ پر درج پیلی عبارت کہیں خاموش، تو کہیں بولنے والے عکس ابھارتی محسوس ہو رہی ہے۔ عکس، جو خاموش ہیں، بولنے والے عکس سے زیادہ نمایاں ہیں۔

ویسے بھی، لفظوں کے پوشیدہ معانی ان کے ظاہری معانی سے زیادہ تیزابی ہوتے ہیں!

سفید کاغذ پر درج یہ پیلی عبارت کچھ نئے پرانے استعاروں سے طاقت بٹورتی ہے۔ پھر وہ اس طاقت سے اپنے ہدف بناتی ہے۔ انہیں نیچے گرانے یا اوپر اٹھانے کا عزم پورا کرتی ہے۔

لفظوں کا پیلا پن عبارت کی غرض و غایت کو اور تیکھا بناتا ہے۔

جو لوگ لفظوں کے اس پیلے پن کو نہیں پہچانتے، وہ اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔

وہ بازار در پر لفظوں کے اس پیلے پن کا معاوضہ چکاتے ہیں۔

جن کے پاس معاوضہ چکانے کی قوت نہیں ہوتی، وہ لفظوں کے زہریلے، تیزابی اثر میں آ کر دم توڑ دیتے ہیں۔

کاغذ کے جس چوکور ٹکڑے پر آج میری کمزور پڑتی آنکھیں ٹکی ہیں، وہاں لفظوں کے گہرے پیلے پن سے جو علامتیں ابھرتی محسوس ہو رہی ہیں، ان کا اصلی رنگ کیا ہے، پیلا یا کچھ اور!

سوہا کے نام

'میرا نام سوہا ہے۔'

اچانک میرے سامنے والے صوفے سے بالکل صاف، سمجھ میں آنے والی آواز سنائی دی۔

میں نے حیرت سے پیچھے مڑکر دیکھا۔

میرے سامنے ایک خوبصورت، نازک، پری سی بچی کھڑی تھی۔

'خوب!' میرے منھ سے نکلا۔ 'مجھے جانتی ہو؟'

'نہیں۔' وہ بولی۔

'پھر!' میں نے کہا۔

'مجھے یہ کتاب چاہئے۔ جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔'

'کیا کروگی اس کتاب کا، پڑھتی ہو؟'

'نہیں... تصویر بناتی ہوں۔ اس کتاب پر تصویر بناؤں گی۔ یہاں کاغذ کاپی نہیں ہے۔'

میرے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔

میں نے اپنی نظموں والی کتاب اسے تھما دی ہے۔

"قلم بھی دیجئے"۔ وہ بولی۔

میری حیرت کی کوئی حد نہیں ہے۔

قلم اور کتاب لے کر بچی پاس والے صوفے پر بیٹھ گئی ہے۔

میں نے دیکھا، اس کی انگلیاں کتاب کے سادے صفحات پر تیر رہی ہیں۔

سری نگر ایئر پورٹ کے اس خوبصورت لاؤنج میں، اس وقت، میرے علاوہ کئی اور مسافر اپنی فلائٹ کے انتظار میں ہیں۔ انہیں آسانی سے انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مسافروں کے ساتھ، ان کے کچھ رشتہ دار بھی موجود ہیں، جو انہیں رخصت کرنے یہاں آئے ہیں۔

دو سال کی یہ بچی، سوبا، ان میں ایک ہے۔ اپنی ممی کے ساتھ کسی عزیز کو 'خدا حافظ' کہنے آئی ہے۔

میری آنکھوں کے پردے پر سری نگر سنٹرل جیل کے اسپیشل وارڈ کے فرش پر بیٹھی بندی عورتوں کے چہرے اُبھر رہے ہیں۔ ان چہروں پر چھایا سناٹا تھوڑی دیر میں ٹوٹتا ہے۔ جب وہ دبی دبی سبکیوں کے سہارے اپنی آنکھوں سے بے ساختہ بہنے والے آنسوؤں کو قابو کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

بندی عورتوں میں کئی عمر دراز ہیں، جو اپنے کنبہ کی کم عمر لڑکیوں کے ساتھ، ایک جیسے الزام میں، گرفتار کر کے یہاں لائی گئی ہیں۔ ان میں کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں، جن کے شوہر کسی حملے کا شکار ہو گئے۔ یا پھر، کافی عرصہ گزر جانے پر بھی، جن کے شوہر کو پولس یا فوج کے کارندے زندہ یا مردہ

تلاش نہیں کر سکے۔ الگ الگ تھانوں میں ان کی گمشدگی کی رپٹ ضرور درج ہوتی رہی۔

لوگ کہتے ہیں، پولس اور فوج کے عملوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان گمشدہ چہروں کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

وہ پولس کو زمین، اور فوج کو آسمان بتاتے ہیں!

ان عورتوں کی بے چینیاں جتنی خود اپنے حالات سے جڑی ہیں، اس سے کہیں زیادہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچے بچیوں کے مستقبل کو لے کر ہیں۔ جنہیں وہ اپنے کچھ بھروسے مند پڑوسیوں کے پاس چھوڑ آئی ہیں۔ ان بچوں کی پرورش اور حفاظت کی فکر ان کے روشن چہروں کی اُداسی بن گئی ہے۔ بار بار، ان کی آنکھوں سے چھلکتے آنسو، شاید ان کے سوتے جاگتے خوابوں کی سچائی بیان کر رہے ہوں۔

ان عورتوں میں کچھ ایسے ماتمی چہرے بھی ہیں، جو لمبی مدت سے اپنی بے گناہی اور معصومیت کے عوض انصاف کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن انصاف کی راہ تب کھلے گی، جب وہ عدالت کے تخت پر بیٹھے حاکموں کے آگے پیش ہوں گی۔ کون جانے، انہیں ابھی انتظار کی کتنی گھڑیاں گزارنا باقی ہیں۔ مہینوں انہیں عدالت میں صرف اس لئے نہیں پیش کیا گیا کہ پولس کے عملے اپنی گاڑیوں سمیت اعلیٰ حاکموں کی خدمت گزاری میں مصروف رہے۔

آنسوؤں میں ڈوبے یہ چہرے اپنی بے چارگی کے لئے حالات کے سوا اور کسی کو قصوروار نہیں ٹھہراتے۔ یہ چہرے درد کی جانی پہچانی آواز میں، اپنے 'رب' سے معافی چاہتے ہیں۔ ہرگز وہ یہ نہیں جانتے کہ سیاست کی کس گردش نے انہیں جیل کی سلاخوں میں ڈال رکھا ہے۔ پر ضرور ہی وہ اپنے ناکردہ گناہوں کے لئے خدا سے معافی کے طلبگار ہیں۔

کہتے ہیں، خدا چہار سمت، چہار مقام موجود ہے۔ ایسی کوئی جگہ نہیں، جو اس کے کرم، اس کی مہربانیوں سے خالی ہو۔

یہ اسپیشل وارڈ، جہاں میں اتنی دیر سے ان شکستہ حال بندیوں کے بیان سن رہا ہوں، ضرور ہی یہ جگہ خدا کی رسائی سے آزاد نہیں ہے!

حاکم کہتے ہیں، جموں کشمیر کی جیلوں میں مقرر سیٹوں سے کم قیدی رکھے گئے ہیں۔ تقریباً ڈھائی ہزار قیدیوں کے درمیان، ایک سو چھ کے آس پاس عورتیں ہیں، جن میں زیادہ تر کے معاملے عدالت میں زیر سماعت ہیں۔

ہلکی بونداباندی اور طوفانی بارشوں کے درمیان، میں نے دبی زبان سے، ان زیر سماعت قیدیوں کے معاملوں کی اعلیٰ سطحی، منصفانہ جانچ، اور انہیں، سنگین الزام نہیں ہونے کی صورت میں، 'عام معافی' دیئے جانے کے امکان کا ذکر کیا تو پولس کے اعلیٰ افسروں کی آنکھوں میں جیسے حیرت کی پرچھائی تیر گئی۔

حالانکہ بعد میں، اس تحریر کے لکھنے تک، نیم فوجی دستوں پر پتھر پھینکنے والے کشمیری نوجوانوں کو 'عام معافی' دینے کا فیصلہ عمل میں آیا۔

میری آنکھوں کے پردے پر تیرنے والے یہ چہرے تھوڑی دیر کے لئے اوجھل ہو رہے ہیں۔

ان کی جگہ لے رہی ہیں، ڈل لیک کے چاروں طرف پھیلی روشنی کی کرنیں، جو پانی کی بے چین لہروں کو سہارا دیتی محسوس ہو رہی ہیں۔

اچانک میری آنکھوں کے پردے پر ایک چھوٹا سا جزیرہ اُبھرتا ہے، اور میں 'چار چنار' کے شاعرانہ تخیل میں ڈوب جاتا ہوں۔ چار چنار، جو کبھی سچ مچ، چار رہے ہوں!

ڈل لیک کی خاموشیوں، اور پانی کی۔ بے چین لہروں کے ساتھ، میری آنکھوں میں کچھ اور منظر اُبھر رہے ہیں۔

کچھ اور منظر! جن میں الفاظ ترنم کا حسین پیکر بن گئے ہیں۔

پیکر، جو کشمیر کے جادوئی حسن کا عکس بن کر اب بھی میری آنکھوں میں تیر رہے ہیں۔

'بُمبرو، بُمبرو، شیام رنگ بُمبرو!!'

نثار ندیم کہہ رہے ہیں، کیسے ایک بھونرا، کسی خوبصورت پھول کی تلاش میں، دیوانہ وار گھوم رہا ہے!

کیسے ایک پھول، رات کی سیاہی میں، کہیں کھو گیا ہے!

رات کی اسی سیاہی سے نکالا ہے مجھے، دو سال کی اس خوبصورت بچی سوہانے۔

جو ابھی ابھی مجھ سے میری نظموں کی کتاب اور قلم مانگ کر لے گئی ہے۔

جو بڑے چاؤ سے اس کتاب کے سادہ صفحات پر اپنی نازک انگلیوں سے کچھ باریک لکیریں اُبھار رہی ہے!

'لیجئے، اپنی کتاب۔' اچانک پاس والے صوفے سے سوہا کی آواز اُبھرتی ہے۔

فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔ سوہا کی ممی اسے لینے آ گئی ہیں۔

میری کتاب لوٹاتے ہوئے سوہا مجھے 'خدا حافظ' کہہ رہی ہے۔

میری آنکھیں کتاب کے سادہ صفحات پر سوہا کی بنائی تصویروں میں کھوگئی ہیں۔

کتاب کے سادہ صفحات پر سوہا کی انگلیوں کے پُر نور نشان ہیں!

میں تمہارے شہر آؤں گا سوہا، پھر آؤں گا۔

میرے لئے اس کتاب کے سادہ صفحات پر اُکیری گئی تمہاری ان لکیروں کے درمیان جو جگہیں خالی رہ گئی ہیں، ان میں اپنی انگلیوں سے کئی کئی رنگوں کے خوبصورت کولاج بنا کر رکھنا۔

میں آؤں گا ضرور، دیکھنا، ضرور!

سارہ کے لئے

سلسلے وار، کئی چھوٹی بڑی مشینوں کا احتیاط سے استعمال کر کے، چہرے پر اطمینان کی لکیریں کھینچتے، ڈاکٹر لال وانی نے کہا۔

'آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں، پاور تقریباً پہلے جیسا ہے۔ اتنے برسوں میں، کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ تین چار مہینے پر، دوبارہ ضرور دکھالیں گے۔'

ڈاکٹر لال وانی کے کمرے سے باہر آتے وقت میرے دماغ میں ایک ہی جملہ جیسے گونج رہا ہو۔ ٹھیک ہیں میری آنکھیں تو پھر ان آنکھوں کے پردوں پر پرچھائیاں سی کیوں چھائی رہتی ہیں، ہر وقت۔ میں ان پرچھائیوں کے پرے کچھ دیکھ کیوں نہیں پاتا! ہر وقت، ان پرچھائیوں کی اوٹ میں ریل کی پٹریاں سی کیوں بچھی نظر آتی ہیں۔ اور پھر، ان پٹریوں پر خون کے چکتے سے کیوں اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میری آنکھیں خون کے ان چکتوں سے پوری طرح ڈھک کیوں جاتی ہیں! پھر ان چکتوں سے آنے والی تازہ خون کی بو میری ناک پر کیوں بچھ جاتی ہے!

ڈاکٹر لال وانی! آپ کہتے ہیں، میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں، انہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ ان کے ویژن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ضرور ہی، ڈاکٹر لال وانی، آپ کی مشینیں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔ خود آپ کی باریک آنکھیں اتنی تجربہ کار ہیں کہ میری آنکھوں میں آئی ہلکی سی تبدیلی بھی آپ سے چھپ نہیں سکتی۔ لیکن ایسا کیوں ہے کہ آپ ان تجربہ کار آنکھوں سے میری آنکھوں پر

اُبھرنے والی پرچھائیاں نہیں دیکھ پاتے۔ اوران پر بچھی ریل کی پٹریاں، جن پر تازہ خون کے چکتے پھیل گئے ہیں، آپ کی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے، ڈاکٹر لال وانی!

مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ڈاکٹر مجھے 'شکریہ' کہہ کرمیز کے دوسرے کنارے کھڑے اپنے کسی معاون کی طرف مخاطب ہوجاتے ہیں۔ میں دروازے کی جانب بڑھتا ہوں۔ ریل کی پٹریاں، خون کے چکتے میرا پیچھا کرتے ہیں۔ پورٹیکو تک، دونوں میرے ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ کار میں بیٹھتے ہی، میں نے اپنی دونوں آنکھوں بند کرلی ہیں۔ ریل کی پٹریاں، اوران پر، دُور دُور، پھیلے تازہ خون کے چکتے میری بند آنکھوں میں اور بھی روشن ہوکر اُبھر رہے ہیں۔

ہوائی جہاز کی پہلی صف میں، کھڑکی کی طرف بیٹھتے ہی، میں نے اپنے فولیو بیگ سے شاہد انور کے ناٹک 'سارہ' کا مسودہ نکال لیا ہے۔ تبھی، سیٹ بیلٹ باندھ لینے کی اپیل کے ساتھ پورے جہاز میں پھیلی تیز روشنی اچانک مدھم ہوکر اندھیرے میں بدل جاتی ہے۔ میں نے کیبن کی طرف دیکھا۔ میرے ہاتھ میں پڑا مسودہ اندھیرے کا شکار ہوگیا ہے۔ آنکھیں جب اندھیرے کی عادی ہوئیں، تو میں نے اوپر ہاتھ بڑھا کر ریڈنگ لائٹ جلانی چاہی۔ سیٹ بیلٹ کچھ زیادہ ہی کس گئی ہے۔ کیبن کرُو نے میری مدد کی اور جہاز کی چھت سے ٹنگے دونوں روشنی کے بُندے مسودے پر مرکوز ہو گئے ہیں۔

آج میں نے پھلوں کے جوس نہیں لیے۔ ناشتے کی ٹرے آئی۔ میرے آگے چھوٹی میز پر پھیلے مسودے کے صفحات دیکھ کر ٹرے لوٹ گئی۔ چائے کافی میرے لئے آج سبھی اجنبی ہو گئے ہیں۔
بازو کی سیٹ خالی ہے، اس لئے میں مسودے کے صفحات، باری باری، اس پر سرکا رہا ہوں۔

یہ میری اس مسودے کی دوسری ریڈنگ ہے۔ آنسوؤں سے بھیگے، تازہ خون میں ڈوبے مسودے کی

دوسری ریڈنگ!

یکا یک مسودے کے صفحات سے ریل کے گڑگڑانے کی آواز اُبھرنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے یکا یک میرے سر سے ریل کے کئی کئی ڈبے، ایک ساتھ، گزر گئے ہوں، تیز آواز کے ساتھ! میں نے گھبرا کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ آسمان پر شام کا دھندلکا پوری طرح چھا گیا ہے، اور ڈوبنے والے سورج کی سنہری کرنیں دم توڑ رہی ہیں۔ آسمان صاف ہے، بالکل صاف۔ دُور دُور تک، بادل نہیں ہیں، بادلوں کی پرچھائیاں تک نہیں ہیں۔

پرچھائیوں سے یاد آیا۔ میری آنکھوں پر چھائی ریل کی پٹریوں کی پرچھائیاں، اور ان پر تازہ خون کے چکتے! چکتے اور پرچھائیاں، جنہیں ڈاکٹر لال وانی کی باریک نگاہیں نہیں دیکھ پاتی ہیں۔ لیکن، جو لگاتار میری آنکھوں پر چھائی ہیں۔

ہوائی جہاز کافی بلندی پر اُڑ رہا ہے۔ میرے ہاتھوں میں مسودے کے صفحات اُن پرندوں کی طرح پھڑ پھڑا رہے ہیں، جنہیں ابھی ابھی کسی تجربہ کار شکاری نے موت کی نیند سلا دیا ہے۔ پرندوں کے جسم سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ تازہ خون کے قطرے!

ممکن ہے، یہ پرندے بے جان ہو کر آسمان کی اونچائیوں پر اُڑنے والے جہاز سے نیچے گر پڑے ہوں اور ان کے جسم سے ٹپکنے والے تازہ خون کے قطرے کسی بنجر زمین پر اُگی ریل کی پٹریوں پر پھیل گئے ہوں۔

تازہ خون کے چکتے!

بنجر زمین پر اُگی ریل کی پٹریاں اور ان پر پھیلے تازہ خون کے چکتے!

میری آنکھوں پر چھائی پرچھائیوں کی فضا شاید ان دونوں نے مل کر تیار کی ہو!

لیکن یہ فضا ابھی مکمل کہاں ہوئی! ابھی اس میں ایک زندہ جسم اور ایک زندہ روح کی بے تابیوں کا رنگ گھلنا باقی ہے۔ تبھی تو یہ فضا شفق کی رنگینیوں کا عکس بن پائے گی! ابھی کہاں!

ابھی ایک زندہ جسم کی بوئیوں سے اس فضا کی دستار بندی ہونا باقی ہے!

میں مسودے کے آخری صفحہ پر ہوں۔

ہوائی جہاز کا میرا یہ سفر بھی شاید اپنی آخری چھلانگ لے رہا ہے۔

میری آنکھوں پر، آسمان کے آنگن میں اُگے ستاروں کی طرح، کسی بنجر زمین پر اُگی ریل کی پٹریاں اور تازہ خون کے چھکتے اُبھر آئے ہیں۔ پٹریاں اور چھکتے!

ہوائی جہاز زمین کو سجدہ کر رہا ہے۔ کیبن کرُو نے ساری روشنیاں جلادی ہیں۔

جہاز کا اندھیرا منھ چھپانے کی کوشش میں ہے۔

لیکن، میری آنکھوں پر پھیلی پرچھائیاں برقرار ہیں۔

پرچھائیاں، جن میں ریل کی پٹریاں ہیں، تازہ خون کے چھکتے ہیں، اور زندہ جسم کی، کئی کئی ٹکڑوں میں بٹی، خوشبوئیں ہیں۔

جہاز کی رفتار ایک دم سے تھم گئی ہے۔

کوئی خوبصورت آواز مسافروں سے درخواست کر رہی ہے۔

’برائے مہربانی، اگلی صف کے مسافروں کو پہلے اُترنے دیں۔‘

میں سیڑھیاں اُترنے کو تیار ہوں کہ کیبن کرُ و نے آواز دی۔

’سر، آپ کے کاغذات۔‘

میں نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں مسودے کے بکھرے صفحات ہیں، جو میں بازو کی سیٹ پر چھوڑ آیا تھا۔

’شکریہ! کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟‘

’جی، میں سارہ ہوں۔‘

’سارہ!‘

’جی، سارہ، سارہ جونس۔ میں گوا سے آتی ہوں۔‘

میری آنکھوں کی پرچھائیاں اچانک ایک برفیلی دُھند میں بدل گئی ہیں!

برفیلی دُھند!

ریل کی بے جان پٹریاں!

تازہ خون کے چکتے!

گنبد ہے خالی

رانچی کے مشہور گوسنر کالج کی مرکزی عمارت۔ نحیف، خستہ حال، ایک انسانی ڈھانچہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا کالج کی اس مرکزی عمارت کے پاس کھڑا پڑا ہے۔ طلبا اور اساتذہ تیز قدموں سے آجارہے ہیں۔ کلاس کی گھنٹیوں کے بیچ قہقہوں اور شوروغل کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔

سائے کی طرح رینگتا یہ انسانی ڈھانچہ عمارت کی پہلی سیڑھی کے پاس کھڑا مایوسی کے عالم میں ہر گزرنے والے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ چہرے پر بدحواسی کی دھند، آنکھیں بے جان، ہاتھوں میں لرزش۔ گندے، میلے کچیلے چیتھڑوں سے ڈھکا جسم!

کوئی پہچانے تو یہ انسانی ڈھانچہ آخر ہے کون، اور کس ارادے سے کالج کیمپس میں گھس آیا ہے!

اپنی خاموش نگاہوں سے یہ ڈھانچہ سیڑھیاں چڑھنے والوں کو دیکھتا ہے۔ بس دیکھتا ہے۔ کالج کی راہداریاں اور گلیارے اس کے جانے پہچانے ہیں۔ ان گلیاروں میں پروان چڑھنے والی نوجوانیاں اس ڈھانچے سے واقف رہی ہیں۔ اس کی قربتوں کی گواہ ہیں۔ لیکن کیا ہے کہ سیڑھیوں سے گزرنے والا کوئی ایک قدم بھی اس کمزور اور ٹوٹے انسانی ڈھانچے کے پاس رک کر اس سے ایک بار نہیں پوچھتا —

'کون ہو تم، کس لئے یہاں آئے ہو؟'

کالج میں طلباء کی بھیڑ ہے۔ اساتذہ بھی اپنے اپنے کمروں میں موجود ہیں۔ ان کی بے جان، بے روح گفتگو جاری ہے۔ حالات پر تنقیدیں، نکتہ چینیاں۔ سیاست کی چاشنی میں ڈوبی فقرے بازیاں، نئی پرانی فلمی ہیروئینیں، موسیقی کے رنگ، آدی واسی سماج کا کھلا پن۔ اور ہاں، بھگوا کرن کے خطرے اور اس کے ذائقے، دونوں پر بے سمت بحثیں جاری ہیں۔

باہر، ان بحثوں سے دور، عمارت کی پہلی سیڑھی کے پاس، جانے کتنی دیر سے ایک انسانی ڈھانچہ کھڑا ہے۔

'کون ہیں آپ، کس لئے یہاں اتنی دیر سے کھڑے ہیں؟'

عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے والوں میں سے کوئی ایک قدم اچانک رک کر اس ڈھانچے سے پوچھ بیٹھتا ہے۔

اس سے پہلے کہ یہ ڈھانچہ اپنی زبان کھولے، سوال پوچھنے والا ابل پڑتا ہے —

'ارے آپ، یہاں، اس حال میں؟ کوئی حادثہ ہوا ہے، جو یہ حال......؟'

'آخری بار اپنے کالج آ گیا ہوں۔ یہ دیکھنے کہ کوئی آنکھ مجھے اس حال میں پہچان پاتی ہے یا نہیں، اور یہ بھی کہ کسی کے پاس میرے لئے ہمدردی کے دو بول بچ رہے ہیں یا نہیں۔ برسوں اس کالج کی چہار دیواریوں میں میری آواز عزت کے ساتھ سنی جاتی رہی ہے۔ دیکھنے آیا ہوں، آخری بار، کہ یہ چہار دیواریاں میری آواز آج پہچانتی ہیں یا نہیں......'

بولتے بولتے یہ انسانی ڈھانچہ لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ جس ایک قدم نے رک کر اس کا حال پوچھا تھا، اسی نے سہارا دیا، نیم بے ہوشی کے عالم میں گھر تک پہنچانے کا انتظام کیا۔

دو دن بعد، رانچی شہر میں ایک خبر پھیلی۔ اسی انسانی ڈھانچے کی موت کی خبر!

تیسرے دن، سیکڑوں نمازیوں کی موجودگی میں یہ ڈھانچہ راتو روڈ قبرستان کی مٹی میں دفنایا گیا۔

دفن کفن کا خرچ کس کس جیب نے برداشت کیا، مجھے نہیں معلوم۔

جس کسی نے بھی کیا ہو، اسے میری محبتیں!

رانچی شہر کسی زمانے میں میرا ٹھکانہ رہا ہے۔ اس کی خوبصورتی، اس کے حسن، اس کی مہمان نوازیاں، اور اس کے کرم کے قصے میرے وجود پر چھائے ہیں۔ اس کی کربناک داستانیں ہر لمحہ میری زندگی کا ساتھ دیتی رہی ہیں۔

پھر اس شہر کو ہوا کیا تھا، اس دن، کہ کوئی ایک بندہ بھی اس ڈھانچے کی بدحالی بانٹنے کو سامنے نہیں آیا۔ کوئی اس سے یہ پوچھنے بھی نہیں آیا کہ آج تمہارے فاقے کا کون سا دن ہے، اور کتنے پیسوں کی مدد تمہیں موت کے منہ سے نکال سکتی ہے۔ کوئی سامنے نہیں آیا، اس شہر بے اماں میں، اور کسی نے اس ڈھانچے کی وہ آخری آواز نہیں سنی، جو اس کے بے جان حلق سے اس آخری لمحہ ادا ہوئی۔

ایک بار یہ انسانی ڈھانچہ میرے دفتر کی سیڑھیاں طے کرتا میرے پاس آ گیا تھا۔ میرے کمرے میں، اس وقت، نرمل ورما اور اشوک باجپئی بیٹھے تھے۔ ڈھیر سارے ہندی کے شاعر اور ادیب بھی تھے۔ بڑھی ہوئی داڑھی، بے ترتیب لباس، ہاتھ میں کپڑے کا ایک میلا کچیلا بیگ سنبھالے، یہ ڈھانچہ جب میرے کمرے میں داخل ہوا، تو صرف میں نہیں، سب کے سب چونک پڑے تھے۔

میں نے اس انسانی ڈھانچے کو پاس والے صوفے پر بیٹھایا اور اپنے ادیب مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔

چلی ہوا تو لرزنے لگی
منڈیر پہ شب
اٹھا غبار تو دیوار و در سے
خواب گرے

اس روز نرمل ورما کے لکچر اور اشوک باجپئی کے کویتا پاٹھ کے دوران، یہ انسانی ڈھانچہ گھنٹوں منچ پر، میرے بازو میں بیٹھا رہا۔ ہال میں ہی، اپنا بیگ کھول کر اس ڈھانچے نے اپنی ڈائری مجھے سونپی اور کہا —

'اب یہ سب کچھ آپ کے حوالے ہے۔ جو چاہیں، کریں۔'

اتنا کہا، اور ڈائری میرے آگے سرکا دی۔

نرمل ورما پھنیشور ناتھ رینو پر لکچر دے رہے تھے۔ کھچا کھچ بھرے ہال میں سامعین ان کے لفظوں کا رس اپنی رگوں میں اترتا محسوس کر رہے تھے۔ اور میں تھا کہ صدارت کی کرسی پر بیٹھا تھا، ڈائری کے اس پہلے صفحے پر چپکی ایک چھوٹی سی تحریر پر میری نظر جیسے جم گئی تھی۔

مفلسی اور تنگی کی آخری حدوں سے گزرتے ایک بڑے تخلیق کار کی آنسوؤں میں ڈوبی تحریر!

وہ دن، اور آج کا دن!

رانچی کے گوسنر کالج کی راہداری سے خالی ہاتھ لوٹا یہ انسانی ڈھانچہ راتو روڈ قبرستان میں اپنی زندگی کی آخری نیند سو رہا ہے۔

میری میز پر اس وقت اس انسانی ڈھانچے کی ڈائری پڑی ہے۔ سیاہ جلد والی ڈائری، جس میں

’لب مماس‘ کے بعد لکھی گئی اس کی نظموں کی دنیا محفوظ ہے۔

موسم اپنے ساتھ نہ لانا
دھول
یہاں تو خوشہ خوشہ
گرد جمی ہے

میں جانتا ہوں، میرے الفاظ راتو روڈ قبرستان میں مٹی تلے دبے اس انسانی ڈھانچے میں زندگی کی روح نہیں پھونک سکتے۔ میں چاہتا بھی نہیں کہ کوئی مسیح اس ڈھانچے میں زندگی کی روح پھونکے اور یہ ڈھانچہ دوبارہ جی اٹھے۔ جی اٹھے گا، یہ ڈھانچہ، تو اسے اپنے اردگرد قطار اندر قطار، انگنت نگاہیں، آگ برساتی دکھائی دیں گی۔

اسی لئے میں نے جب ش اختر اور صدیق مجیبی کی زبانی وہاب دانش کی موت کی خبر سنی، تو اپنے رب سے دعا مانگی کہ ہرگز اس انسانی ڈھانچے میں دوبارہ زندگی کی روح مت ڈالنا۔ رہنے دینا اسے، اسی طرح، منوں مٹی سے دبا، تاکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوست احباب اور نزدیکیوں کی نامہربانیاں بھی مٹی تلے دبی رہیں۔

یہاں تو ریت پہ بہتی ہوئی
آکاش گنگا ہے
یہاں سایہ بھی ننگا ہے

سنہرے اکشر

جگہ ہے، اتر بہار کا ایک چرواہا ودیالیہ۔ تاریخ اور وقت صفر ہے۔

بارہ سالہ سنگیتا کماری سچ بولنا چاہتی ہے۔ مگر آنگن باڑی کی سیویکا اسے سچ بولنے سے روکتی ہے۔

سنگیتا کہنا چاہتی ہے کہ کھانے کی صورت میں ملنے والی روٹیاں اچھی طرح پکتی نہیں ہیں۔ کبھی کبھی، کچا آٹا بھی انہیں کھانے کو ملتا ہے۔ جسے کھا کر ان کے پیٹ میں درد اٹھ جاتا ہے اور انہیں کئی کئی دن اسکول سے غیر حاضر رہنا پڑتا ہے۔

آنگن باڑی سیویکا کام کے بوجھ کا ذکر کرتی ہے۔ اسے ایک ہزار روٹیاں سینکنی پڑتی ہیں۔ اس کام کے لئے صرف چار کرمچاری تعینات کئے گئے ہیں۔ سیویکا کا کہنا ہے، بھلا چار لوگ مل کر بھی ۵۰ کیلو آٹا کی روٹیاں اور سبزی دال کیسے تیار کر سکتے ہیں۔

اسکول میں ہفتہ میں دو دن طلباء و طالبات کو سبزی دال کی جگہ مانس پروسا جاتا ہے۔ سیویکا ئیں کہتی ہیں، جس دن ۲۰ کیلو مانس بنتا ہے، طلباء کی تعداد عام دنوں سے دوگنی ہو جاتی ہے۔ بقیہ دن پہلے درجہ میں ۷۰، دوسرے میں ۲۰، تیسرے میں ۶۴ اور چوتھے کلاس میں ۴ ہی طلباء باضابطہ طور سے آپاتے ہیں۔

اسکول میں ۱۵۰ تھالیاں، کٹورے اور گلاس دستیاب ہیں۔ بچوں کو تھالیاں تو ملتی ہیں، لیکن کٹورے

اور گلاس کے درشن نہیں ہوتے۔

وجہ پوچھنے پر، سیویکائیں کہتی ہیں۔ ایک بار تھالیاں، کٹورے اور گلاس دیئے گئے تھے، لیکن چار تھالیاں، کچھ گلاس اور کٹورے چوری چلے گئے۔ اس لئے اب تھالیاں سنبھال کر دی جاتی ہیں۔ کٹورے اور گلاس بھنڈار میں بند رہتے ہیں۔

چوری کون کرتا ہے؟ چھوٹے یا بڑے؟ بچے یا نوجوان؟...... یا اساتذہ؟

بچے تو اپنی ٹوٹی پھوٹی لیکن محتاط زبان میں جواب دے جاتے ہیں، لیکن بڑوں کے پاس کوئی بھروسے لائق جواب نہیں۔

یہ پوچھنے پر کہ پانت میں بیٹھنے والا بچہ یا بچی برتنوں کی چوری کیسے کرسکتی ہیں، سیویکائیں اشاروں کی زبان میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہیں کہ طلبا و طالبات تو کچھ گھنٹوں کے لئے اسکول آتے ہیں۔ ان کی اصلی تربیت تو ان کے گھروں میں ہوتی ہے۔

کیا سیویکائیں یہ کہنا چاہتی ہیں کہ چرواہا ودیالیہ کی روشنی ابھی گاؤں گھر کے پریواروں تک نہیں پہنچ سکی ہے؟

اسکول میں مانجھی، پاسوان اور یادو بچے بچیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان کا آپسی دوستانہ رویہ دکھانے نہیں محسوس کرنے کے لائق ہے۔ لیکن ہاں ان میں سے کچھ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ آخر مانجھی پریوار کے بچوں کو مہینہ میں ۳۰ روپے اور انہیں صرف ۹ روپے کیوں ملتے ہیں۔

بچے آخر بچے ہیں، وہ ابھی کیوں کر جانیں گے کہ مانجھی کی زندگی اوروں سے کس طرح مختلف ہے۔

چرواہا ودیالیہ کے بچے مجھے کسی لحاظ سے شہری بچوں کے مقابلے کم سمجھدار نہیں لگے۔ ان میں سے

دو، منوج اور پرمود، ترقی پا کر پہلے کلاس سے چوتھے کلاس میں چلے گئے ہیں۔ انہیں اس غیر معمولی ترقی کے لئے انعام دینے کا اعلان ہوا تھا، جو کسی وجہ سے عمل میں نہیں لایا جا سکا۔ اس کا کرب انہیں ستاتا ہے۔ لیکن یہ کرب ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں بنا ہے۔ وہ آگے اور بھی اچھی پڑھائی کے خواہشمند ہیں۔

بچے دور دراز کے گاؤں سے پیدل چل کر اسکول آتے ہیں۔ انہیں کوس ڈیڑھ کوس کی دوری بھی طے کرنی پڑتی ہے۔ پانچ چھ برس کے کئی بچوں نے درد بھرے لہجے میں کہا، کبھی کبھی ہم تھک جاتے ہیں اور بارش ہونے پر بھیگ کر کئی کئی دنوں کے لئے بیمار بھی پڑ جاتے ہیں۔

اسکول کے بچے کپڑوں میں نظر آئے، بھلے ہی وہ صاف نہ ہوں۔ ایک مانجھی اور ایک یادو بچی کی کلائی پر گھڑی بھی دکھائی دی، جس کے نمبر ڈیجیٹل ہیں۔

اسکول جب کھلا تو وہاں دو چاپا کل لگے، لیکن اب صرف ایک ہی چالو حالت میں ہے۔ وہ بھی بڑی مشکل سے چلتا ہے۔ سات سالہ للیتا کے مطابق، کبھی کبھی چاپا کل چلاتے وقت اس کی انگلیاں چھل جاتی ہیں۔

اسکول کے بغل میں اس چھوٹے ٹولے کا چاپا کل بھی افتتاح کے چھ مہینے کے اندر ہی بیکار ہو گیا۔ اس کے ہینڈل اور پائپ چمپا اور ارمیلا نے سنبھال کر رکھے ہیں۔ گاؤں واسیوں کو اس چاپا کل کی مرمت اور دو نئے چاپا کل درکار ہیں۔ انہوں نے امید نہیں چھوڑی ہے۔

شہر لوٹتے لوٹتے، میں ایک بار پھر چرواہا ودیالیہ کے آنگن میں ہوں۔

میں نے اپنی نوٹ بک چرواہا ودیالیہ کے طالب علموں کے آگے پھیلا دی ہے۔

میری نوٹ بک پر پانچ بال چرواہوں کے دستخط ہیں: منوج، پرمود، سنگیتا، للیتا اور دیوندر مانجھی۔

میں ان پانچ دستخطوں کے ساتھ راجدھانی لوٹ آیا ہوں۔

یہ دستخط مستقبل کے خوابوں کی طرح میری نوٹ بک پر جگمگا رہے ہیں!

ندی کی پوشاک

وشنو پد مندر کی وسیع سیڑھیاں اترتے وقت مندر کی گھنٹیوں کے علاوہ میرے کانوں میں جو آواز گونج رہی ہے، اسے میں کیا نام دوں؟

سوچتے سوچتے، میرے پیر اس جگہ پہنچ گئے ہیں، جہاں سیڑھیاں ریت میں بدل جاتی ہیں!

میرے سامنے پھلگو کا ڈھائی ہزار فٹ چوڑا پاٹ ہے۔ ریت کے سمندر کی طرح پھلگو کا یہ پاٹ مندر میں موجود ہزاروں شردھالوؤں کے لئے اس وقت دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر اس بھری دوپہر میں جلتی تپتی ریت پر اترنے والے چہروں کو دیکھ رہے ہیں۔

سامنے ریت پر آٹھ دس سال کے درجن بھر بچے ٹن کے ڈبے لئے اپنی انگلیوں سے ریت کی اوپری پرتیں ہٹا ہٹا کر خوش ہو رہے ہیں، تالیاں بجا رہے ہیں۔ ریت کی اوپری سطح ہٹتے ہی تپتی ریت کی گرمی یکا یک ہلکی ٹھنڈک میں بدل جاتی ہے۔

بچے ریت کی نچلی سطحوں سے نکلنے والے پانی کو ٹن کے ڈبوں میں جمع کر رہے ہیں۔

ڈبہ آدھے سے زیادہ بھر جانے پر وہ اسے لے کر میرے پاس آتے ہیں۔

میں نے اپنی انگلیاں ڈبے کے ٹھنڈے پانی سے بھگو کر بچوں کی خوشیاں بانٹ لی ہیں۔

تب تک دو چار ڈبے لے کر کچھ اور بچے میرے پاس آجاتے ہیں۔

تپتی ریت کے نیچے ٹھنڈے پانی سے بھرے ڈبے!

'کتنی دیر لگتی ہے، ایک ڈبہ بھرنے میں؟'

میں نے بچوں سے پوچھا۔

ننگ دھڑنگ بچوں میں سے ایک بول اٹھتا ہے، 'بس، ذرا سی دیر۔ اتنی ہی دیر جتنی آپ اپنے پرکھوں کا نام یاد کرنے میں لگاتے ہیں۔'

بچے کی حاضر جوابی دیکھ کر ہمارے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

ہم مقامی افسروں کے ساتھ ریت پر کچھ اور قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ اپنے ہاتھوں میں بڑا سا نقشہ سنبھالے ڈی ایم مہروترا اور ان کے معاونین اسکیم سے جڑے مختلف نکتوں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ اسکیم کا بنیادی مقصد یہ پتہ کرنا ہے کہ ایک حد میں پھلگو کے پانی کو ندی کی اوپری سطح سے کم سے کم پانچ فٹ کی اونچائی تک سال بھر کے لئے کیسے جمع کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے تال کی شکل میں، جس کے چاروں طرف سیڑھیاں اور گلیارے ہوں، جن سے تیرتھ یاتری آسانی سے ندی میں اتر سکیں اور ضرورت کے مطابق پانی لے سکیں۔

تکنیکی صلاح کار کہتے ہیں، ریت کی نچلی سطحوں پر جالی لگا کر بیچ سے آنے والے پانی کو آسانی سے تال کی شکل میں جمع کیا جا سکتا ہے۔

کہیں ہم ندی کے فطری مزاج اور ریت کی پرتوں سے چھیڑ چھاڑ تو نہیں کر رہے ہیں!

اپنے اندر اٹھنے والا سوال میں نے تفصیل سے افسروں کے سامنے رکھا ہے۔

'اپنی اس اسکیم کو لے کر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ماہرین سے صلاح ومشورہ کر لینا لازمی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ برسات کے سیلاب میں پانی کے ساتھ جو مٹی اور کچرا ندی میں بہہ کر آتا ہے، اس کی صفائی کیسے ہوگی۔'

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پھلگو کی ریت پر گزار کر مندر کے کیمپس سے باہر آتے وقت میں نے سوچا، ریت تو پھلگو ندی کی پوشاک ہے۔ ریت ہٹا کر پانی نکالیں گے، تو اس پوشاک کا کیا ہوگا!

پھلگو ایک تہہ آب رواں ندی ہے۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ساری تاریخیت کے باوجود ہندی لغت میں اس ندی کو 'سارہین' بتایا جاتا ہے۔ کوئی اسے اس کے صاف شفاف معانی یعنی 'پھل دینے والی ندی' کی شکل میں نہیں مانتا۔ سب اسے ایک 'سوکھی ندی' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

تاریخ نویس پھلگو ندی کا ایک اور کرب بیان کرتے ہیں، اس کا اپنا کوئی منبع نہیں۔ اس کا وجود دو دیگر ندیوں، نرنجنا اور موہنا پر ٹکا ہے۔ انہیں دونوں ندیوں کے سنگم سے پھلگو ندی کا وجود قائم ہے۔ آگے چل کر بھی یہ ندی اپنا وجود بنائے نہیں رکھ پاتی۔

اس کی شاخیں الگ الگ ناموں سے یاد کی جاتی ہیں۔

مندر سے لوٹتے وقت، میں رہ رہ کر سوچتا ہوں، ریت سے اپنا کئی کئی جنموں کا رشتہ ہے۔ اپنے پرکھے پھلگو ندی کی ریت پر جنمے تھے۔ اپنا جنم بھی پھلگو ندی کے ریتیلے آنگن میں ہوا تھا۔ اس پھلگو ندی کے آنگن میں، جسے ہندی اردو کے شبدکوش 'سارہین' بتاتے رہے، مگر جو ایک تہہ آب رواں پھل دینے والی عظیم ندی ہے۔

مجھے یہ ندی اور اس کی سفید چادر پر پھیلی ریت ایسا سکھ دیتی ہے، جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا

جا سکتا۔

تاریخ نویس کہتے ہیں، اس ندی کا اپنا کوئی منبع نہیں۔ اس کا وجود دو دیگر ندیوں پر ٹکا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں، دو دیگر ندیوں سے بہہ کر آنے والا پانی پھلگو کی گود میں آ کر ریت کی تہوں میں اس طرح خاموش کیوں بیٹھ جاتا ہے۔ اسے ندی کی اوپری سطحوں کا دلکش منظر کیوں نہیں راس آتا!

میرے لئے پھلگو کی ریتیلی گود میری ماں کے دودھیا آنچل کی طرح ہے۔ جیسے پھلگو اپنے دکھ درد کسی کو نہیں بتاتی، ریت کے ان ذروں کو بھی نہیں، جو خود اس کے وجود کا حصہ ہیں، ویسے ہی میری ماں نے بھی اپنے دکھ درد کسی کو نہیں بتائے۔

ساری زندگی وہ بھی اپنے دکھوں پر دبیز چادر ڈالتی رہی۔

ہم بھی، جو ریت کے ذروں کی طرح، اس کے وجود کا حصہ تھے، کہاں اس کے دکھ درد کو جان پائے!

ریت کی انگنت پرتوں کے نیچے دبی اس کی شیتل چھایا اپنے لہو سے ہمیں سینچتی رہی ہے!

اکیلی نہیں ہوگی دھوپ

رات کے آخری پہر کی سیاہی گئی نہیں ہے ابھی، کہ میں نے کھول دیا ہے اپنے کمرے میں آنے والا دروازہ اور کھڑکیوں کے بیڑے بھی گرا دیئے ہیں۔

ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے میرے بدن میں سہرن پیدا کر رہے ہیں۔

دیر دیر بعد آیا ہے سورج کے اگنے کا وقت، اور آہستہ آہستہ اوپر کی طرف سرکنے لگا ہے سورج۔

کم دلچسپ نہیں سورج کے اوپر سرکنے کا منظر۔ سورج سے نکلنے والی دھوپ بازو کی تین منزلہ عمارت سے ہو کر، پام ٹری کی شاخوں کو چھوتی ہوئی جب اوپر کی طرف بڑھتی ہے، میرے چھجے پر اس وقت نہیں ہوتی ہے دھوپ۔ نہیں ہوتی ہے اس کی پرچھائی!

سورج کے اگنے کا صرف احساس ہوتا ہے، بھلے ہی اس احساس میں سورج کی گرمی شامل نہیں ہو۔

دھوپ میرے چھجے کو، میری چھت کی منڈیروں کو چھو نہیں پاتی، حالانکہ میں نے کھول رکھا ہے اپنا دروازہ، اور اپنی کھڑکیوں کے بیڑے بھی گرا رکھے ہیں۔

دھوپ دراصل میرے چھجے اور میری چھت کی منڈیروں پر آتی ہے اس وقت، جب آس پاس کے گھروں میں باقی نہیں رہتی اس کی ضرورت۔

آتی ہے میرے چھجے پر دھوپ، جب لوگ شام پسرتے دیکھ بند کر لیتے ہیں اپنے دروازے، اپنی

کھڑکیاں۔ تب آتی ہے میرے چھجے پر دھوپ۔

چھجے سے ہو کر آنے والی دھوپ داخل ہو کر میرے کمرے میں بھر دیتی ہے اسے اپنی روشنی سے۔

ایسا ہی ہوتا ہے ہمیشہ، اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں سورج اگنے سے پہلے کھول دیتا ہوں اپنا دروازہ، گرا دیتا ہوں اپنی کھڑکیوں کے بیڑے اور، سہرن بھرے احساس کے ساتھ، بینت کی ایک پرانی کرسی لے کر اپنی آنکھیں چھجے کی جانب ٹکائے بیٹھ جاتا ہوں، ہر روز!

سامنے کھلی چھت پر صاف دھلے کپڑے سکھانے آتی ہیں لڑکیاں، دھوپ کے اوپر سرکنے سے پہلے، اور پوری چھت ڈھک جاتی ہے، صاف دھلے کپڑے سے۔ رنگ برنگے کپڑے، چھوٹے بڑے، ہر سائز، ہر کاٹ کے کپڑے، روایتی کپڑے اور جدید بھی۔ کپڑے تنگ اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے، اوڑھنیاں، لہنگے، ساڑیاں۔

نہیں پہنچتی جب تک میرے چھجے پر دھوپ، سامنے کھلی چھت پر لہراتے رہتے ہیں، سرد ہوا میں، لڑکیوں کے کپڑے۔

اکثر سوچتا ہوں میں، دھوپ کے آنے سے پہلے ہی شاید لڑکیوں کے کپڑے آدھے سوکھ جاتے ہیں۔ باقی آدھے، سوکھتے ہیں دھوپ کے آنے پر، دھوپ کی آنچ میں، کیوں کہ میں نے نہیں دیکھا دھوپ کے آنے کے بہت دیر بعد تک سامنے چھت پر ایک کونے سے دوسرے کونے تک ٹنگے تار پر پھیلے رنگ برنگے کپڑوں کو۔ لڑکیاں سمیٹ لیتی ہیں اپنے کپڑے، اس سے پہلے کہ چھت پر دھوپ کی چھتری تن جائے۔

میرے چھجے پر آتی ہے دھوپ، سامنے والی چھت سے ہو کر۔ کبھی کبھی اسی لئے صاف دھلے کپڑوں کی جگمگ کرتی روشنی بھی دھوپ کے ساتھ آ جاتی ہے، میرے چھجے تک۔

ایسے میں، سوچنے لگتا ہوں میں کہ اس روشنی میں کتنا ہے دھوپ کا حصہ!

کتنا بھی ہو دھوپ کا حصہ، اور جگمگ کپڑوں کی روشنی، میرے لئے اپنے چھجے پر آنے والی دھوپ کا احساس ہی کافی ہے۔ دھوپ کا احساس، جو میرے بدن کی سہرن کو کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی امیدوں میں بدل دیتا ہے۔

دھوپ آتی ہے میرے چھجے پر آس پاس کے تمام گھروں سے ہو کر۔ پام ٹری کی لمبی شاخوں سے جھانکتی، صاف دھلے کپڑوں کی کھلی بانہوں اور کھلی ادھ کھلی سلوٹوں سے چھن کر۔ آتی ہے، میرے چھجے پر دھوپ، خوشبوؤں کی رنگت سمیٹے، جس میں اتر آتے ہیں الگ الگ کاٹ کے کپڑے۔

تنگ اور ڈھیلے، صاف سفید اور ست رنگے۔

دھوپ کی آنچ میں تپے کپڑوں کی گرمی چھجے سے ہو کر اتر آتی ہے میرے کمرے میں، اور بینت کی اس پرانی کرسی میں اپنا کانپتا بدن لئے، دھوپ کی جانب آنکھیں بچھائے، کچھ لمحوں کے لئے، میں زندگی کی روشنی سے بھر بھر جاتا ہوں۔

دھوپ آتی ہے میرے چھجے پر، سب گھروں سے ہو کر۔

لیکن یہ موسم دھوپ کے ٹھہرنے کا نہیں، اس کے اترنے کا ہے!

میرے کمرے میں آتی ہے دھوپ، چھجے سے ہو کر، خاموشی سے، پھر نیچے اتر جاتی ہے دھوپ، کیونکہ یہ موسم دھوپ کے ٹھہرنے کا نہیں، چھجے سے نیچے، بالکل نیچے، اتر جانے کا ہے!

جانتا ہوں، اترتی ہے جب میرے چھجے سے تو اکیلی نہیں ہوتی ہے دھوپ۔ میری سانسوں کی نمی ہوتی ہے، اس کے ساتھ۔

بیت کی اس پرانی کرسی پر بیٹھے بیٹھے، میں نے دیکھا ہے، چھجے سے اترنے والی دھوپ بھیگ گئی ہے، اکثر۔ بوندیں ٹپکتی ہیں، اس کی پلکوں سے۔ میرے چھجے کی بدرنگ زمین کو بھی گیلا کر جاتی ہے دھوپ۔ لوٹ جاتی ہے دھوپ، خاموش اور گیلی!

اگلے دن پھر میں، روز کی طرح، بیت کی اس پرانی کرسی پر، سورج اگنے سے پہلے، دروازہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں۔ گرا دیتا ہوں کھڑکیوں کے بیڑے۔ ہر روز کی طرح، گھر جاتا ہے میرا بدن سہرنوں سے۔ میرے چھجے سے پھسلتے وقت، اکیلی نہیں ہوتی ہے دھوپ!

کل پھر، میں بیٹھوں گا اس چھجے پر، کھول کر اپنا دروازہ، گرا کر اپنی کھڑکیوں کے بیڑے۔

آئے گی دھوپ، سامنے والی چھت سے ہو کر، پام ٹری کی شاخوں سے چھن کر، آئے گی دھوپ۔

لیکن جائے گی جب میرے چھجے سے، اکیلی نہیں ہو گی، دھوپ!

زندہ ہونے کا ثبوت

'کتنے گہرے ہیں زخم؟'

نکیلے جوتے پہنے آدمی نے کارندے سے پوچھا۔

'اتنے کہ ہم ناپ نہیں سکتے۔'

'چھوڑ دینے پر زخم بھر تو نہیں جائیں گے؟'

وہ پوری طرح مطمئن ہونا چاہتا تھا۔

'لگتا ہے، پر آپ کہیں تو ہم اسے کچھ اور گہرا کر سکتے ہیں۔'

آنکھوں کا اشارہ پا کر کارندے بے ہوش، نیم مردہ آدمی کے سینے پر اپنے زہریلے اسلحوں کا دوبارہ استعمال کرنے لگے۔

بدن سے رسنے والا خون دھار بن کر گیلی زمین میں جذب ہونے لگا ہے۔

ایک پل کے لئے بے ہوش آدمی کے جسم میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی ہے۔

پھر جیسے سب کچھ ٹھہر گیا ہو!

آسمان سے انگارے برس رہے ہیں۔

جب کہ یہ انگاروں کے برسنے کا موسم نہیں ہے۔

گلیاں سنسان ہیں راہگیر رستہ بھول بیٹھے ہیں۔

پیڑوں کی شاخیں ساکت ہیں۔

پتیاں اپنی ہریالی کھو رہی ہیں۔

گلی کے آخری کونے پر ہزار برس پرانی حویلی کے کھنڈر کی ایک کھڑکی نہ معلوم کب سے نیم وا ہے۔
ایک سایہ ہے کہ کھڑکی پر لگی لوہے کی تیلیاں پکڑے گلی کی طرف نظریں جمائے ہے۔
اپنی ہتھیلیاں اس نے دعا کے انداز میں آسمان کی طرف پھیلا رکھی ہیں۔

نکیلے جوتوں والا آدمی اب پوری طرح مطمئن ہے۔
گلی کے رتیلے پتھروں کے بیچ، بے ہوش آدمی کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہے!

'ہے اس آدمی کے زندہ ہونے کا کوئی ثبوت باقی؟'

'نہیں۔'

چاروں طرف سے کارندوں کی آواز......آواز نہیں، گونج ابھرتی ہے۔

ہزار برس پرانی حویلی کے کھنڈر کی کھڑکی میں لوہے کی شکستہ تیلیاں پکڑے کوئی سایہ اب بھی دعائیہ

انداز میں اپنی ہتھیلی آسمان کی طرف پھیلائے کھڑا ہے!

'اب......اسے کھائی میں پھینک آؤ۔'

نکیلے جوتوں سے آواز آئی۔

ایک نے لاش اکیلے اپنے کندھے پر اٹھائی اور کھائی کی طرف بڑھا۔

چار قدم ہی چلا ہوگا شاید کہ اس کی چیخ سنائی دی۔

لاش میں تھرتھراہٹ کے ساتھ حرکت ہوئی۔

زخمی ہاتھ کی انگلیوں میں دبے قلم کی نوک نے لاش اٹھانے والے کی گردن میں گہرا زخم کردیا ہے۔

خون کی لکیریں اس کی نیم فوجی پوشاک کو گیلا کررہی ہیں۔

ہزار برس پرانی حویلی کے کھنڈر کی کھڑکی پر کوئی سایہ موجود نہیں ہے!

□□
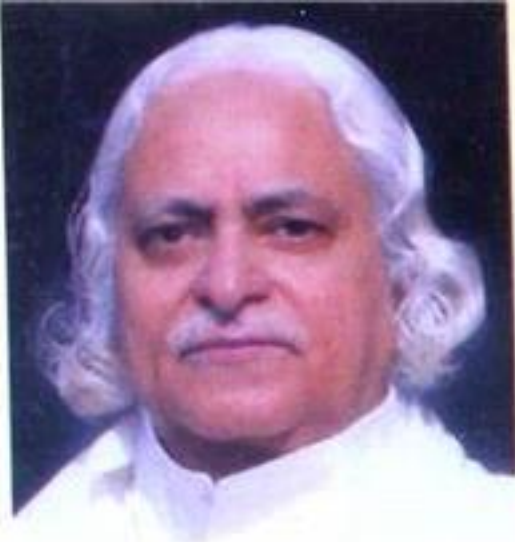
جابر حسین

انگریزی زبان وادب کے پروفیسر رہے۔ جے پی تحریک میں بیحد فعال کردار نبھایا۔ ایمرجنسی کے دوران انڈر گراؤنڈ ادب تیار کیا۔ ۱۹۷۷ میں مونگیر سے بہار ودھان سبھا کے لئے منتخب، کابینہ وزیر۔ ۹۵۔۱۹۹۰ میں بہار اقلیتی کمیشن کے چیرمین۔ ۲۰۰۶۔۱۹۹۵ تک بہار ودھان پریشد کے چیرمین۔ ۲۰۱۲۔۲۰۰۶ پارلیامنٹ (راجیہ سبھا) کے رکن۔

ہندی اردو میں دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع۔ اردو فارسی کے تقریباً ۵۰ مسودوں کی ترتیب و تدوین۔ ودھان پریشد کی میگزین ساکشیہ، دستاویز، اردو مرکز عظیم آباد کی میگزین 'ترجمان' اور 'اردو نامہ' کی اشاعت۔ ۷ برسوں سے ہندی ادبی میگزین 'دوآبہ' کے مدیر۔

اعزاز : ۲۰۰۵ میں اردو کتھا ڈائری 'ریت پر خیمہ' کے لئے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ۔ ۲۰۱۲ میں نویں عالمی ہندی کانفرنس (جوہانس برگ، جنوبی افریقہ) میں عالمی ہندی اعزاز۔

تخلیقات : یہ شہر لگے موہے بن، ریت پر خیمہ، سن اے کاتب، بے اماں، زندہ ہونے کا ثبوت، ڈولا بی بی کا مزار، لوگاں، جو آگے ہیں، اتیت کا چہرہ، آلوم لا جاوا، دھونی مت کافی نہیں، دو چہروں والی ایک ندی، ریت ریت لہو، ایک ندی ریت بھری، بہار کی پسماندہ مسلم آبادیاں۔

ترتیب : چھ جلدوں میں بہار حسین آبادی کی تصنیفات۔ دیوارِ شب، دیارِ شب، حصارِ شب، نگارِ شب (اردو نامہ کے شمارے)۔

رابطہ : ۲۴۷ ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ۔۸۰۰۰۲۰